بدن کا طواف

آدم جی ادبی انعام یافتہ

دوسرا ایڈیشن

امراؤ طارق

نام —— اسرارؔ طارق

جائے پیدائش۔ فتح پور (ہسوہ) یوپی

درسگاہیں (۱) مدرسۂ اسلامیہ (مسلم انٹر کالج فتح پور ہسوہ)
(۲) مجیدیہ اسلامیہ کالج الٰہ آباد
(۳) حلیم مسلم کالج۔ کان پور
(۴) اُردو کالج۔ کراچی

شغلہ معاش۔ سرکاری ملازمت

شغلہ ادبی۔ افسانہ نویسی
خاکہ نگاری

ادبی زندگی (۱) نائب صدر اُردو سوسائٹی اُردو کالج کراچی (۱۹۵۷-۵۸ء)
(۲) صدر مجلس ادب (بین الکلیاتی) کراچی (۱۹۵۸-۵۹ء)
(۳) صدر ڈبیٹنگ سوسائٹی اُردو کالج کراچی (۱۹۵۸-۵۹ء)
(۴) مدیر اُردو کالج میگزین (۱۹۵۹-۶۰ء)
(۵) مدیر اُردو کالج میگزین (۱۹۶۰-۶۱ء)
(۶) رکن ادارۂ مصنفین پاکستان
(۷) معاون مدیر ماہنامہ نگار پاکستان

پہلا مطبوعہ افسانہ۔ فانوس کراچی۔ ۱۹۵۷ء

پہلی مطبوعہ تصنیف۔ بدن کا طواف۔ ۱۹۷۹ء

تالیفات (۱) برگِ گل خاص شمارہ۔ ۱۹۵۹ء
(۲) برگِ گل مولوی عبدالحق نمبر۔ ۱۹۶۱ء
(۳) نگارِ پاکستان، محمود حسین نمبر، حسرت موہانی نمبر، مسائلِ زبان نمبر، قائداعظم نمبر، جوہر نمبر، افسانہ نمبر (زیرِ ترتیب)

دوسری کتابیں (۱) تنکے (ناول) زیرِ طبع
(۲) خاکے زیرِ طبع

جناب شارب ردولوی
کی نذر محبتوں کے ساتھ ۔

احمد طارق

۲۷ ۱۱/۸۷

کراچی

بدن کا طواف

افسانے

امراؤ طارق

آدم جی انعام یافتہ

دوسرا ایڈیشن

صبا پبلیکیشنز

۱۰-سی ڈیفنس کمرشل ایریا اے، کراچی

ناشر — صبا پبلیکیشنز، ۱۰ سی ڈیفنس، کمرشل ایریا اے، کراچی

سرورق — آذر زوبی

خطاطی — محمد اسلم تلمیذ ابنِ المناس رقم

باردوم — ۱۹۸۱ء

تعداد — ایک ہزار

مطبع — آئیڈیل پیکیجز۔ کراچی

قیمت — تیس روپے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

کے نام

جن کی شفقت

میرے لئے

تاریکیوں میں روشنی کی کرن بن گئی

پہلے حرف

اکثر اوروں نے اور خود میں نے اپنے آپ سے بارہا یہ سوال کیا ہے کہ میں کہانیاں کیوں لکھتا ہوں۔
میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں اس لئے کہ میں کہانی نہیں لکھتا۔ کہانی اپنے آپ کو مجھ سے لکھواتی ہے۔
جب کوئی کہانی جنم لیتی ہے اُس وقت اس کی صورت صرف ایک احساس کی سی ہوتی ہے پھر وقت کے ساتھ ساتھ
اُس کے خدوخال ذہن میں واضح ہونے لگتے ہیں اور کہانی کے سارے کردار نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں،
ذہن پر بوجھ سا محسوس ہوتا ہے اور ہر لمحہ خلش سی رہنے لگتی ہے حتیٰ کہ اس کرب سے نجات پانے کے لئے قلم کو
سہارا بنانے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ جب میں کہانی کا آخری حصہ ختم کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے طویل
سفر میں چلتے چلتے پاؤں میں مسلسل چبھنے والی کیل جوتے سے نکل گئی ہو۔

بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ دن میں کہانی کہنے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں اور اپنے گھر نہیں
پہنچ پاتے۔ یہ بچپن کی باتیں ہیں۔ گرمیوں میں جب اسکول بند ہو جاتے اور میں شہر سے گاؤں پہنچتا تو میرے گاؤں
میں رہنے والے ہم عمر دوست شہر کی باتیں پوچھتے میں بھری دوپہر میں کسی دہلیز، بیٹھک یا گھنے سائے دار درخت
کے نیچے سب کو جمع کر لیتا اور مسافروں کے راستہ بھولنے سے بے نیاز اور اُن کے گھر نہ پہنچنے سے بے پروا
من گھڑت کہانیاں، چشم دید واقعات کے عنوان سے ساری دوپہر سناتا رہتا اور میرے کم سن دوستوں کی آنکھوں

میں حیرت، خوف اور اشتیاق کے سائے لرزتے رہتے لیکن ان سب کو یقین ہوتا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں سچ ہے۔ ان کے اس غیر متزلزل یقین سے مجھے مسرت اور آسودگی ملتی۔ اب میں اپنے اُن دوستوں سے شرمسار ہوں اس وقت میں جھوٹ بولتا تھا مگر وہ سچ کی طرح اُن کے چہروں پر دمکتا ہوا دکھائی دیتا تھا آج سچ لکھتا ہوں تو جھوٹ کا گماں ہوتا ہے۔ ہاں مجھے ان مسافروں سے کوئی ہمدردی نہیں جو راستہ بھول گئے ہوں گے اور گھر نہ پہنچے ہوں گے میں اُن سے کوئی ہمدردی کر بھی نہیں سکتا کہ خود راستہ بھول گیا ہوں اور گھر کی تلاش میں ہوں۔

میں یہ سچے حرف آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں بالکل اُسی طرح جیسے اپنے معصوم دوستوں کو کسی دہلیز، بیٹھک یا گھنے سائے دار درخت کے نیچے، بھری دوپہر میں کہانیاں سناتا تھا اور وہ میرے ہر لفظ کو اپنے اندر کی معصومیت اور سچائی کے باعث سچ جانتے تھے اب یہ حرف آپ کی نذر ہیں۔

اُمرائو طارق

اکتارا

اِکتارا میرے ہاتھ میں تھا۔

سامنے چٹیل میدان کے دوسرے سرے پر ریت کے ٹیلوں سے دور ناریل کے دو متوازی درخت ساکت اور محوِ حیرت کھڑے ہوئے تھے۔ سب کچھ اُداس تھا۔ سارے میں مایوسی کی ایک لہر پھیلی ہوئی تھی اور اِکتارا میرے ہاتھ میں تھا۔

رجمنٹ آج ایک سال کے بعد جزیرے سے واپس لوٹ رہی تھی۔ جوانوں کا سامان باندھا جا چکا تھا اور لکڑی کے مضبوط تختوں کی بنی ہوئی لمبی، کئی دروازوں اور چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والی بیرک میں جگہ جگہ رول کئے ہوئے بستر اور سیاہ ٹرنک بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ سگرٹوں کے خالی پیکٹ، پرانے اخبار اور خالی ڈبے اِدھر اُدھر لڑھک رہے تھے۔ دیواروں پر جوانوں کی لگائی ہوئی فلم ایکٹروں، ایکٹرسوں کی تصویریں، کلنڈر اور انگریزی میگزین سے نکالے ہوئے مناظر کے صفحات ہوا سے اُڑ رہے تھے۔ جوانوں کے بھاری بوٹوں کے نیچے بیرک کے کرم خوردہ تختے چرچرا رہے تھے جو ٹرک کا انتظار کرنے

ہوئے بے مقصد اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ کچھ جزیرے کے ایک سال پرانے ملاقاتیوں اور دوستوں کو الوداع کہنے گئے تھے۔ ایک سال کی رفاقت کے بعد ہمیشہ کی جدائی نے سب ہی کو ملول کر دیا تھا۔

میری پیکنگ ہو چکی تھی۔ میں سارا منظر دیکھتے ہوئے عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ میرے سامنے حدِ نظر تک ریت کے چھوٹے بڑے ٹیلے پھیلے ہوئے تھے جن کے پیچھے خلیج بنگال کی تند و تیز بپھری ہوئی لہریں ساحل سمندر پر نرم و سفید جھاگ اچھال رہی تھیں اور تیز نم ہوا بیرک کی کھڑکیوں میں سرسرا رہی تھی۔ لیکن ناریل کے متوازی درخت چپ چاپ محوِ حیرت کھڑے ہوئے تھے جن کے قدموں میں چھوٹی چھوٹی بے رنگ سی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور ہم کو چٹاگاؤں لے جانے والا اسٹیمر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ بیرک سے صرف اسٹیمر کا تکونا جھنڈا نظر آ رہا تھا۔

یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ جس میں روپ چند نامی مچھلیاں ہیں دریاں، ساریاں اور چٹائیاں بُننے والی حسین اور کم گو لڑکیاں ہیں۔ چیخ چیخ کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر تیز تیز باتیں کرنے والی بوڑھی اور ادھیڑ عورتیں ہیں، مدک اور لانبی بدبودار بیڑیاں پینے والے کمزور زرد رو مرد ہیں اور ننگ دھڑنگ گلیوں میں شور مچانے اور کیچڑ میں کھیلنے والے بچے ہیں جو لکڑیوں اور چٹائیوں کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ مرد صبح سے شام تک مچھلیاں پکڑتے ہیں اور رات کو کیلے یا کٹھل کے ساتھ چاول کھانے کے بعد ہوم میڈ پائپ میں مدک بھر کر اینٹ یا پتھر کا سرہانہ بنا کر زمین پر لیٹ جاتے ہیں اور مدک کے پھونک مارتے ہوئے سو جاتے ہیں۔ ان کا اس جزیرے کے باہر کی دنیا سے صرف اتنا تعلق ہے کہ اسٹیمر پر آنے والے تاجروں کو مچھلیاں دریاں اور ساریاں دے کر اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لیتے ہیں۔ اس جزیرے سے باہر کوئی اور دنیا بھی ہے ان کو اس کا قطعی احساس نہیں ہے۔ ان کی زندگی مچھلیوں اور مدک تک محدود ہے۔ اس جزیرہ سے باہر جانا ان کے نزدیک اپنے بزرگوں کی روح سے بغاوت ہے جوان لڑکیاں تمام دن گھروں میں لگی ہوئی کھڈیوں پر دریاں اور کپڑے بنتی ہیں اور رات میں کھلی ہوا میں نکل کر گاتی ہیں اور بوڑھی عورتیں پتے

کی بیڑیاں پیتی ہوئی لڑکیوں کو گانوں کے بول اور رقص کے انداز بتاتی رہتی ہیں۔ اُن میں سے بعض جوش میں آکر لڑکیوں کے رقص میں شریک ہو جاتی ہیں۔

سب ہی گانے کے بول دہراتے رہتے ہیں۔

یہ سمندر جس نے ہمیں جنم دیا۔

دھرتی جس نے ہمیں دانے دیئے۔

اور یہ آزاد ہوائیں جنھوں نے ہمیں صحت اور حسن دیا۔

یہ سب ہمارے ہیں۔

اے سمندر تو ہمیں عزیز ہے۔

اس لئے کہ تو نے ہمیں جنم دیا۔

اے خدا ہمارے دلوں کو کبھی ویران نہ ہونے دینا۔

تو ہمارے دلوں کو بھر دے گا۔

ہمیں معلوم ہے۔

نوجوان لڑکیوں کے گیت، سریلی آوازوں کے دوش پر سارے جزیرے میں پھیل جاتے ہیں اور ساری فضا سحر زدہ ہو جاتی ہے۔ نغمہ جسموں میں حرارت اور دلوں میں اُمنگ بھر دیتا ہے۔ زندگی سے بھرپور قہقہے اس طرح سنائی دیتے ہیں جیسے مندر میں بے شمار گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ چاند ایک لمحے کے لئے رک جاتا ہے اور آسمان بے انتہا نیلا اور بہت دور محسوس ہونے لگتا ہے اور ناریل کے متوازی درخت ایک دوسرے پر جھک کر سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں۔ اُن کے قدموں میں اُگی ہوئی بے رنگ جھاڑیاں سیاہی مائل سبز لگنے لگتی ہیں اور اُن میں جنگلی پھولوں کی بے نام مہک بس جاتی ہے۔ ستارے آنکھیں موند کر ٹھنڈی سانسیں لینے لگتے ہیں۔ تب مدک کے نشے میں جھومتے ہوئے مرد اپنے اپنے بستروں کی طرف لوٹ آتے ہیں۔

ہمارا کیمپ سمندر کے کنارے ہے اور شمال کی طرف چھالیہ کے درختوں سے گھرا ہوا لکڑیوں کے تختوں اور چٹائیوں سے بنے ہوئے مکانوں پر مشتمل خوبصورت گاؤں ہے۔

اس گاؤں کے رہنے والے ہمارے کیمپ تک دودھ اور مچھلیاں لاتے ہیں۔ جب گاؤں کے مرد صبح اپنے کاندھوں پر جال اٹھا کر سمندر کی طرف چلے جاتے ہیں تو گاؤں کی سلونی لڑکیاں سروں پر دودھ کے مٹکے لئے ہمارے کیمپ کی طرف آتی ہیں۔ اُن کی نظریں ہمیشہ زمین پر گڑی ہوتی ہیں اور چہرے پر بلا کی سنجیدگی ہوتی ہے۔ وہ بہت کم بولتی ہیں اور بہت زیادہ سہمی اور سمٹی سی رہتی ہیں۔ معمر عورتیں زیادہ تر گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف رہتی ہیں

اس جزیرے میں بسنے والوں میں توہم پرستی عام ہے۔ ان کی رسمیں عجیب ہیں۔ یہ طوفانوں کو خدا کی ناراضگی تصور کرتے ہیں اور جانوروں اور اناج کو سمندر میں پھینک کر خدا کو بھینٹ دیتے ہیں۔

وبائی امراض کی صورت میں مچھلیاں دھاگے میں گوندھ کر گلے میں پہن لیتے ہیں۔ گیتوں کی دیوی کو رقص و سرود سے مناتے ہیں۔ پورنماشی کی رات کو شادیاں کرتے ہیں اور بہت سے چراغ روشن کر کے جھیل میں تراتے ہیں اور پھولوں کی پتیاں گہرے پانی میں دور تک پھیلا دیتے ہیں۔ موت کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ مرنے والے کو چپ چاپ رات کے اندھیرے میں سمندر میں بہا دیتے ہیں اور نہ روتے ہیں نہ ایک دوسرے سے مرنے والے کا ذکر کرتے ہیں۔ جب کئی دنوں تک کوئی نظر نہ آئے تو خود ہی اُس کو مردہ تصور کر کے بھول جاتے ہیں اور کسی سے اُس کے بارے میں دریافت نہیں کرتے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ ڈاک آتی ہے اور ایک شکستہ سی عمارت میں سرکاری ہسپتال ہے جس میں نہ ڈاکٹر ہوتا ہے نہ دوائیں۔ یہاں کے لوگ علاج کے قائل ہی نہیں ہیں۔ اپنے اصولوں، روائتوں اور رسموں پر ہمیشہ سے قائم ہیں اور ان میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی یا رد و بدل کو پسند نہیں کرتے۔

مجھے یہاں آئے ہوئے تیسرا دن تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا میں چھالیہ کے درختوں کے بیچ میں گھرے ہوئے گاؤں کی طرف نکل گیا۔ بدبودار کیچڑ اور دھنوئیں سے بھری ہوئی گلیوں میں ننگ دھڑنگ بچے آپس میں لڑ رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے یا کھیل رہے تھے۔ مرد کاندھوں پر جال ڈالے ٹوکریوں میں مچھلیاں لئے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ عورتیں دن کا کام ختم کر کے مکانوں کے سائبان یا گلیوں کے کنارے سورج کی الوداعی کرنوں سے

جسم سینک رہی تھیں۔ گاؤں کی دوسری جانب آخر میں جہاں چھالیہ کے درختوں کا سلسلہ اچانک ختم ہو گیا تھا لکڑی کے ایک خوشنما مکان کے سائبان میں میں نے اُسے پہلی بار دیکھا۔ مکان کے دروازے کی دونوں جانب گہرے سرخ پھولوں والی بیل چڑھی ہوئی تھی وہ دروازے میں بیل کی بنی ہوئی محراب کے درمیان خاموش کھڑی ہوئی تھی۔ چُپ چُپ اداس اداس جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ طویل اور مسلسل انتظار نے جیسے اُسے تھکا دیا ہو۔ اس نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا، اُس کے چہرے پر پتھر کی مورتی جیسی بے حسی اور بے تاثیری تھی۔ وہ اپنے سپاٹ چہرے اور خالی خالی نظروں سے مجھے مسلسل دیکھے گئی حتیٰ کہ میں گلی کے موڑ پر مڑ گیا۔

پورنماشی کی رات کو میں لیٹا ہوا گاؤں کی اُسی پُراسرار لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے میں ہر روز ہی سرخ پھولوں والی محراب کے درمیان ڈوبتے سورج کی نرم خوشگوار دھوپ میں پتھر کی مورتی کی طرح کھڑی ہوئی دیکھا کرتا تھا کہ گاؤں سے گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، بستر پہ کروٹیں بدلنا عذاب لگ رہا تھا میں گاؤں کی طرف چل دیا۔ گاؤں کے وسط میں ایک جھیل تھی جس کے گرد گاؤں کے مرد، عورتیں سب ہی جمع تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے الاؤ جل رہے تھے جن سے خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ جھیل میں بے شمار دیئے تیر رہے تھے اور پانی پہ پھول کی رنگ برنگی بے شمار پنکھڑیاں تیر رہی تھیں۔ جھیل کے اردگرد ٹولیوں میں لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ کچھ لڑکیاں ایک جانب بیٹھی مل جل کر گا رہی تھیں اور ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے جزیرے میں رنگ و نور کی بارش ہو رہی ہے۔ گانے والی لڑکیوں میں وہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسی طرح چُپ چُپ اُداس اُداس، کھوئی کھوئی سی۔ اُس نے سفید ساری پہن رکھی تھی، گلے میں سفید موتیوں کی ایک مالا پڑی ہوئی تھی اور بائیں کلائی میں ایک پتلی سی چوڑی تھی۔ کانوں میں ایک ایک سفید پھول اور جوڑے میں کلیوں کا گندھا ہوا ہار لپٹا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ وہ نہیں ہے، کوئی آسمانی مخلوق ہے جو چند لمحوں کے لئے برکتوں کی بارش کرنے گناہگار انسانوں میں آگئی ہے اور یہ تمام انسان اُس کے وجود سے نا آشنا

اس کی برکتیں سمیٹ رہے ہیں۔

گاؤں والوں نے ازراہ مہمان نوازی مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا اور بتایا کہ پورنماشی کی رات وہ اپنی کنواری لڑکیوں کے بیاہ کرتے ہیں اور جب ایسا کوئی موقعہ نہ ہو تو بھی اس رات کو وہ خوشیاں مناتے ہیں۔ بہاروں کے گیت گاتے ہیں۔ یہ رات اُن کے لئے خوشیوں اور برکتوں کی رات ہوتی ہے۔ میرے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے مچھلی اور تمباکو کی بُو آ رہی تھی اور سامنے کنواریاں رقص کر رہی تھیں کنواریاں گا رہی تھیں۔

میرے ماہی گیر
نوکا کھینتے جاؤ کھینتے جاؤ۔
دور سمندر کی اونچی لہروں میں۔
اپنے کاندھوں پر جال اُٹھائے۔
جہاں لہریں آکاش سے مل جاتی ہیں۔
جب سورج سرخ ہو جائے گا۔
جب دھوپ سنہری اور خوشگوار ہو جائے گی۔
اپنے جال میں چاندی سی مچھلیاں اُٹھائے۔
تم گھر لوٹو گے۔
نوکا کھینتے جاؤ۔

جھیل کے چاروں طرف رقص ہو رہا تھا۔ ٹولیاں الاؤ کے گرد رقص کر رہی تھیں۔ لڑکیاں گا رہی تھیں۔ چاندنی اور الاؤ کی روشنی میں سب کچھ خوابناک سا محسوس ہو رہا تھا۔

اس رات جب رقص ختم ہو گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اُس لڑکی کا باپ گٹھیا کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہے۔ دوسری صبح میں بوڑھے کو دیکھنے گیا۔ اُن لوگوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور خوشبودار کافی پلائی میں نے بڑی مشکل سے اُسے علاج پہ مجبور کیا اور غالباً میری دل شکنی کے خیال سے اُس نے رسماً آمادگی ظاہر کر دی۔ میں نے کیمپ کے ڈاکٹر سے اُس کے لئے دوائیں حاصل کیں اور خود شام کو اپنے ہاتھوں سے

اُس کی مالش کرنا اور دوا پلاتا۔ جسے وہ مسکراتا ہوا بے دلی سے پی لیتا۔ اِس طرح وہ پُراسرار اور منتظر سی لڑکی میرے قریب تر ہوتی گئی۔

اُس کا نام یوجی تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ گاؤں کے آخر میں لکڑی کے تختوں کے مکان کے علاوہ چھالیہ کے بہت سے درخت بھی اُن کی ملکیت ہیں۔ اُس کا باپ قبیلہ کا سردار ہے۔ اس بیماری کے سلسلے میں اب تک اُنہوں نے کئی من چاول اور سینکڑوں جانور سمندر کی بھینٹ چڑھا دئے ہیں۔ میں روزانہ شام کو مالش کرنے اور بوڑھے کو دوا پلانے جاتا اور خوشبودار تمباکو والے سگرٹ اُسے دے آتا وہ بہت ہی منکسر المزاج اور نرم گو تھا۔ اُس نے میرے یوجی سے ملنے پر بھی کبھی اعتراض نہ کیا۔ رات میں جب چاند بلند ہو کر ناریل کے درختوں میں اُلجھ جاتا تو ہم اُن درختوں کے قریب چلے جاتے۔ وہاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے، ایک دوسرے پر ریت اُچھالتے۔ پھر ریت پر گھروندے بنانے اور توڑ دیتے حتیٰ کہ چاند ناریل کے درختوں سے پرے کھسک جاتا اور سردی بڑھ جاتی۔

ایک رات ہم ناریل کے متوازی درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے وہ کوئی گیت گا رہی تھی اُس کے لہجے اور چہرے کے تاثرات سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی غمگین گیت ہے جس میں محبوب کی جدائی کا غم ہے۔ میں نے ناریل کے درختوں پر اپنا اور یوجی کا نام چاقو سے لکھ دیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا یہ کیا لکھا ہے میں نے اُسے بتا دیا وہ اُداس ہو گئی۔

"یہاں رانو کا نام لکھ دو۔"

"رانو کون ہے؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے جس درخت پر یوجی کا نام لکھا تھا اُسی پر رانو کا نام لکھ دیا۔ وہ مسکرا دی۔

"رانو کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا منگیتر"

میرے سینے میں کچھ ٹوٹ سا گیا۔

"رانو کہاں رہتا ہے ؟"

اُس نے سمندر کی طرف اشارہ کیا۔

"میں سمجھا نہیں!" مَیں نے کہا۔

"رانو سمندر میں ڈوب گیا ہے۔ وہ بڑی بھیانک رات تھی۔ طوفان آیا تھا" وہ اُداس ہو گئی۔

"اُسے مرے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا"

"دو سال"

"پھر تم نے شادی کیوں نہیں کی"

"میں اُس کا انتظار کر رہی ہوں" وہ خاموش ہو گئی اُس کی آنکھوں کی افسردگی سارے ماحول میں پھیل گئی۔ چاند ناریل کے درختوں سے دور چلا گیا اور سردی بڑھ گئی تو ہم واپس آ گئے۔

میری یوجی سے پھر کئی روز تک ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ بھی ناریل کے درختوں کی طرف نہ آئی۔ مجھے شبہ ہوا کہ کہیں یوجی ناراض نہ ہو گئی ہو۔ مجھے اُس سے شادی کے بارے میں کچھ نہ کہنا چاہئے تھا۔ شاید یہ بات اُسے پسند نہ آئی ہو اُس نے مجھے ایک دو اس طرح کے واقعات بتائے تھے جن میں لڑکیوں کو اس سلسلہ میں جان دے دینی پڑی اُس شام میں یوجی کے گھر گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ یوجی حسب معمول سرخ پھولوں والی محراب کے وسط میں کھڑی رانو کا انتظار کر رہی تھی کہ اس نے سورج غروب ہونے سے قبل گھر لوٹنے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس کے چہرے پر سورج کی الوداعی کرنوں اور سرخ پھولوں نے شفق کی سرخی مل دی تھی۔ یوجی کی ماں کے چاندی کے تاروں جیسے سفید بال چمک رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی جب میں بوڑھے سے مزاج پُرسی کے بعد سائبان میں آیا تو یوجی سائبان میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اُس سے ناریل کے درختوں تک نہ آنے کا سبب پوچھا تو مسکرا دی۔

"میں چاہتی تھی تم مجھے بلانے آؤ"

"میں آگیا"

"ہاں تم سے مل کر آج بہت خوش ہوئی ہے"

"ایک بات کہوں"

"نہ"

"تمہارے بارے میں"

"صرف ایک بات"

"ہاں"

"میرے بارے میں بہت سی باتیں کہو"

"اچھا سنو"

"سن رہی ہوں"

"شادی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے"

وہ سنجیدہ ہوگئی اور چپ چاپ اندر چلی گئی۔

اُس رات جب ہم ناریل کے درختوں کے قریب ملے تو یوجی بہت خوش تھی۔ اُس نے اپنے قبیلے کا خاص لباس پہن رکھا تھا۔

جس میں وہ بے انتہا خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ سر پر موتیوں کی بنی ہوئی ٹوپی اور کلائی میں تازہ پھولوں کے کڑے اُسے اور بھی دلکش بنا رہے تھے۔ اُس شام اس نے ریشم کے سرخ رومال میں لپٹا ہوا ننھا سا اکتارا مجھے دیا اور کہا کہ درخت سے راتو کا نام مٹا دو کیونکہ وہ مر چکا ہے اور میں وہاں نہیں کھڑی رہ سکتی جہاں اُس نے دو سال پہلے مجھے چھوڑا تھا اب سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں نے اکتارا اُس سے لے لیا۔

اس شام ہم نے ریت پر گھروندے بنائے جنھیں یوجی نے توڑنے نہیں دیا وہ بے انتہا خوش تھی اُس نے مجھ پر ریت بھی نہیں اُچھالی، گھروندے بھی نہیں توڑے۔ وہ مجھ سے شہروں کے بارے میں پوچھتی رہی جہاں راتوں کو رنگین روشنیاں بکھر جاتی ہیں جہاں

چمکتے ہوئے لباس میں خوشیاں ہیں اور سکھ ہے۔ اُس نے مجھ سے میرے گھر والوں کے بارے میں بھی پوچھا اُس کا خیال تھا میری ماں بہت بوڑھی اور میری جدائی میں کمزور ہوگئی ہوگی۔ اُس رات اُس نے چاند کے بلند ہونے کا انتظار نہیں کیا۔ مَیں نے یوجی کو جاتے ہوئے بہت دور تک دیکھا وہ دور ہوتی رہی اور میں اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی چال میں جانے کہاں سے دلہنوں کا بانکپن آگیا تھا۔ اس کا گایا ہوا نیا گیت میرے کانوں میں گونجتا رہا۔

تم آ گئے۔

میرا ماہی گیر آ گیا۔

مَیں تنہا نہیں ہوں۔

آج رات جب تم پھولوں کا ہار پہن کر میرے گھر آؤ گے۔

مَیں تمہارے قدموں کی دھول بن جاؤں گی۔

کل کا سورج نکلنے سے پہلے تم مجھے اپنی آغوش میں چھپا لینا۔

یہ ہی ریت ہے۔

میں تمہاری ہوں۔

میرا ماہی گیر آ گیا ہے۔

جب وہ گا رہی تھی مجھے ایسا لگا جیسے اس گیت میں کوئی پیغام ہے۔

دوسری صبح میرے لئے اپنے ساتھ راکھ اور ریت لائی۔ یہ صبح یوجی نے نہیں دیکھی۔ وہ سورج نکلنے سے قبل ہی مر چکی تھی۔ اُس دن گاؤں کا کوئی ماہی گیر جال لے کر سمندر کی طرف نہیں گیا۔

لڑکیاں بھی دودھ لے کر کیمپ کی طرف نہیں آئیں۔ سارا گاؤں جیسے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب میں گاؤں پہنچا تو یوجی کو جلانے والی چتا بجھتی جا رہی تھی۔ بوڑھی ماں نڈھال ہو چکی تھی اور باپ گٹھیا سے جکڑی ہوئی ٹانگوں کو پکڑے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے چتا کے سرد ہوتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ یوجی کے مکان کے

سامنے کیلے کے مرجھائے ہوئے پتے لٹک رہے تھے اور زمین پر رنگین بُرادے سے بنائے ہوئے نقش و نگار مٹتے جا رہے تھے۔ پھولوں کے بے شمار ہار مسلے اور ٹوٹے ہوئے پڑے تھے اور پھولوں کی پنکھڑیاں ہوا میں ادھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی جشن ہوتے ہوتے کوئی سانحہ پیش آ گیا ہو۔ گاؤں کے لوگوں نے مجھے دیکھا تو اُن کے چہرے پر تناؤ اور کشیدگی آ گئی۔ کچھ لوگوں نے مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ لڑکیاں گھروں میں گھس گئیں۔ گاؤں کا کوئی فرد مجھ سے مخاطب نہ ہوا۔ سب لوگ چپ چاپ چِتا کو دیکھتے رہے۔

یوجی کو مرے ہوئے آج دوسرا دن ہے آج بھی گاؤں کے لوگ جال لے کر سمندر کی طرف نہیں گئے نہ لڑکیاں دودھ اور مچھلیاں لے کر کیمپ کی طرف آئیں۔ سارا گاؤں جیسے مر گیا ہو۔

رجمنٹ کے سارے جوان اب اسٹیمر پر آ چکے ہیں۔ بیرک خالی ہو چکی ہے۔ میرا سامان بھی اسٹیمر کے کیبن میں پہنچ گیا ہے میں یوجی کا دیا ہوا یادگار ننھا سا اکتارا لیئے ہوئے عرشے پر کھڑا ہوا چھالیہ کے درختوں کے پیچھے چھپا ہوا یوجی کا گاؤں اور ناریل کے دو متوازی درخت دیکھ رہا ہوں جن میں سے ایک پر میرا اور دوسرے پر یوجی کا نام اب بھی لکھا ہوا ہے۔ اسٹیمر روانہ ہونے میں اب چند منٹ باقی ہیں۔ اس کے بعد یوجی کا گاؤں اور یہ محوِ حیرت کھڑے ناریل کے متوازی درخت کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ اور یہ اکتارا ــــــ

"بڑا خوبصورت اکتارا ہے"۔ اسٹیمر کے بوڑھے ملاح نے اِکتارا میرے ہاتھ سے لے کر کہا۔ "آپ نے بنایا ہے"۔

"نہیں مجھے تحفہ ملا ہے"۔

"خوب ــــــ کس نے دیا"۔ ملاح کچھ زیادہ ہی سراغرسی پر اُتر آیا۔

"اُس گاؤں کی ایک لڑکی نے"۔ میں نے سچ سچ بتلا دیا۔

وہ مجھے تقریباً کھینچتا ہوا کیبن میں لے گیا۔

"اب بتاؤ یہ اکتارا تمہیں کب اور کس نے دیا" وہ قطعی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے یوجی سے اپنی ملاقات سے اُس کی موت تک کا واقعہ بیان کر دیا وہ رونے لگا۔

"میرا تعلق اسی جزیرے سے ہے"۔ بوڑھے ملاح نے کہا۔

"اس جزیرے کی ریت ہے کہ جب کوئی لڑکی اپنے شوہر کا انتخاب کر لیتی ہے تو اپنے ہونے والے شوہر کو پورنماشی کی رات سے قبل کسی وقت اپنے ہاتھوں کا بنا ہوا کوئی کھلونا پیش کرتی ہے۔ پھر لڑکے کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اُسی پورنماشی کی رات کو لڑکی کو بیاہ لائے یا پھر تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دے۔ لیکن اگر لڑکا پورنماشی کی رات کو لڑکی کو بیاہنے نہیں پہنچتا تو اسے سارے قبیلے کا اپمان سمجھا جاتا ہے اور سزا کے طور پر سورج نکلتے ہی لڑکی کو جلا دیا جاتا ہے اور گاؤں کا کوئی شخص لڑکے سے کبھی گفتگو نہیں۔۔۔۔"

"لڑکی کو جلا دیا جاتا ہے"۔ میں چیخا۔

"ہاں جناب۔ جب لڑکی والدین کو اپنے شوہر کے انتخاب کی اطلاع دیتی ہے تو والدین خوشی سے اُس کا فیصلہ قبول کر لیتے ہیں اور لڑکا جب تحفہ قبول کر لیتا ہے تو وہ لڑکی کو رخصت کرنے کا اعلان کر کے سارے قبیلے کو مدعو کر لیتے ہیں اور رخصتی کا جشن شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر لڑکا تحفہ لینے کے باوجود نہ پہنچے تو پھر لڑکی کو جل کر جان دینی پڑتی ہے"۔

بوڑھا ملاح نہ معلوم اور کیا کیا بتاتا رہا۔ میں کیبن سے بھاگ کر دیوانوں کی طرح باہر نکلا۔ اسٹیمر چل رہا تھا۔ ناریل کے متوازی درخت آنکھوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ حدِ نظر تک پانی ہی پانی تھا۔ میرا سر چکرا گیا اور میں ریلنگ کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ اسٹیمر کے ساتھ ساتھ اُڑتے والے سفید پرندے اب جزیرے کی طرف لوٹ رہے تھے۔ یوجی کے گاؤں کی طرف۔ یوجی جو ایک مدت تک رانو کا انتظار کرتی رہی۔

پھر میں نے یوجی کی آنکھوں میں ساری زندگی کا انتظار ایک رات کا لمحہ بنا دیا۔ اکتارا دے کر اُس نے میرا انتظار شروع کر دیا ہو گا۔ ایک ایک پل قدموں کی آہٹ پر کان لگائے گذرا ہو گا۔ پھر اس انتظار میں سارا گاؤں شریک ہو گیا ہو گا۔ شعلوں کی طرف بڑھتے ہوئے یوجی نے کئی بار مڑ کر بڑے اعتماد سے دیکھا ہو گا۔ شعلوں نے یوجی کا انتظار چاٹ لیا۔ گیت جل گئے۔

ناریل کے چپ چاپ محوِ حیرت کھڑے ہوئے درخت اُسی طرح ٹیلوں سے دور اب بھی کھڑے ہوں گے۔ اُن پر میرا اور یوجی کا نام اب بھی لکھا ہو گا۔ ریت پر ہمارے بنائے ہوئے گھروندے جنھیں یوجی نے نہ توڑا تھا۔ اب بھی بنے ہوں گے۔

○

یہ اپنے گھروں کو مسجدوں کی طرح سجا دیتے ہیں یہ عبادت خانوں
جیسے گھر جہاں پاؤں پھونک پھونک کر رکھنے پڑتے ہیں ذرا سا چوکے
اور چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔ کہیں غافل ہوئے اٹھی کیٹ کا بت ریزہ ریزہ
ہو گیا۔ ذہن کہیں، دل کہیں لیکن چہرے پر شوکیس میں سجی گڑیوں جیسی
مسکراہٹ چپکی ہوئی ہے۔ ان اونچی سنگلاخ عمارتوں کے اندر جیسے سب
سچائی کے خلاف سازشیں کر رہے ہوں۔

مٹی کے کھلونے ———

مٹی کے کھلونے

ریشماں آج پھر اپنی کھولی کی چوکھٹ سے لگی ہوئی بیٹھی تھی۔ اندر زنگ آلود لالٹین کی ملگجی روشنی میں دیوار پر سائے لرز رہے تھے۔

رات کے کوئی گیارہ بجے تھے۔

شرفو میاں حسبِ معمول گردن جھکائے ہوئے ریشماں کی کھولی کے سامنے سے گزرے اور ٹیلیفون ایکسچینج کی پیلی عمارت کی طرف بڑھ گئے۔

"عجیب عورت ہے۔ رات بھر یونہی چوکھٹ سے لگی بیٹھی رہتی ہے" شرفو میاں نے سوچا اور افسروں کے بنگلوں کے گرد کھنچی ہوئی کانٹوں دار تاروں کی باڑھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے لکڑی کے تازہ وارنش کئے ہوئے پھاٹک میں داخل ہو گئے۔ ساگوان اور وارنش کی ملی جلی بو بڑی اجنبی سی لگی۔

دسمبر کے آسمان پر ننھے ننھے تارے سہمے سہمے سے کانپ رہے تھے

چھوٹے چھوٹے قدموں سے بغیر کسی آہٹ کے چلتے ہوئے شرفو میاں اپنے الگ تھلگ

کمرے کے سامنے پہنچ کر ایک لمحے کے لئے رُکے اور پھر زینے سے ہوتے ہوئے بنگلے کی کھلی چھت پر پہنچ گئے۔ خنک سرسراتی ہوئی ہوا اُن کے لمبے اور ڈھیلے ڈھالے کرتے کو پھڑپھڑاتی ہوئی گزر گئی۔ شرفو میاں نے روئی کی بنڈی کے بٹن گلے تک بند کئے اور رومال کو گلے سے اُتار کر کانوں کے گرد لپیٹ لیا۔ سامنے اکھڑی اینٹوں اور پھوس کی قطار اندر قطار کھولیاں رات زیادہ گزر جانے کی وجہ سے ویران دکھائی دیتی تھیں جن کی ملگجی قطاروں کے درمیان صرف بیشماں کی کھولی میں روشنی کی مٹی مٹی سی لکیر نظر آرہی تھی۔ شرفو میاں نے رسیلی مٹی اور دھوئیں کی ملی جلی اس بُو کو محسوس کیا جو ان کھولیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے چپکے سے اُن کے دماغ میں گھس جایا کرتی تھی۔ اوپر چھت پر ٹھنڈی سرسراتی ہوا تھی۔ شبنم کی تہہ تھی اور جاڑوں کی رات کا سکون اور اداسی تھی۔

عدالتوں اور پٹواری کی فائلوں اور ریکارڈ کے صاحبزادہ شریف الدین خاں کو گاؤں والے صرف شرفو میاں کہتے تھے۔ اُن کے والد عزیز الدین خاں سے صرف عجو میاں تھے شرفو میاں زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے تھے گاؤں میں لکھاوری اینٹوں کی لق و دق حویلی تھی اور اسی حویلی سے شرفو میاں سارے گاؤں پر حکم چلاتے تھے۔ کبھی کبھی حویلی کی بیٹھک میں اُن کا دربار عام لگتا تھا اور رعایا کے چھوٹے موٹے مقدموں کا فیصلہ ہوتا۔ اختیارات چھینے جاتے اور تقسیم کئے جاتے۔ زمینیں ایک سے لی جاتیں اور دوسرے کو دے دی جاتیں۔ معافیاں ہوتیں اور تنبیہہ کی جاتی۔ کبھی کبھی سزائیں بھی دی جاتیں اور شرفو میاں کے کارندے سزا پانے والوں کو ہنٹروں سے پیٹتے۔ اُن کی حویلی سارے ضلع میں پرانی حویلی کے نام سے مشہور تھی۔ یہ حویلی گاؤں والوں کے لئے ایک پراسرار محل کی طرح تھی جہاں سے اُن کی حاجت روائی بھی ہوتی تھی اور گوشمالی کے احکام بھی جاری کئے جاتے تھے۔ غیر مرد صرف حویلی کی دہلیز تک جا سکتا تھا۔ حویلی کے اندر کا کام صرف عورتیں کرتی تھیں اور یہی عورتیں اپنے گھروں میں حویلی کی بیبیوں اور صاحبزادوں کے جھوٹے سچے قصے بیان کر کے حویلی کو پراسرار بنائے رکھتی تھیں۔ جو عورت حویلی میں کام کرتی وہ اپنوں میں اِتراتی اور شیخی مارتی اور گاؤں والے اُس کا لحاظ کرنے لگتے۔ تھانے کا حاکم بغیر شرفو میاں سے ملے بڑی سے

بڑی واردات کی تحقیق اور گرفتاری نہ کر سکتا تھا۔ اور شرفو میاں اگر تھانے دار کی مدد پر آمادہ ہو جاتے تو خود ہی ملزم کو حاضر کرا دیتے اور ضمانت پر اُس کی رہائی کا انتظام کراتے۔

شرفو میاں کی رعایا میں زیادہ تعداد نیچی جاتی کے ہندوؤں کی تھی اور وہ بلا شرکتِ غیرے اپنے علاقے کے اعلیٰ حاکم تھے۔ اگر کسی دوسرے زمیندار نے اُن کے معاملات میں مداخلت کی یا اُن کے اقتدارِ اعلیٰ کو چیلنج کیا تو پھر شرفو میاں نے اُس کا ہر طرح مقابلہ کیا۔ فوجداریاں ہوئیں۔ قتل ہوئے، مقدمے چلے مگر وہ اپنی تمام روایات کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔

شرفو میاں منڈیر کے سہارے کھڑے ہو گئے۔ ماضی، کانپتے ہوئے مدھم ستاروں اور ریشماں کی کھولی کی ملگجی روشنی میں واضح ہوتا گیا۔ ساجد کی ماں۔ شرفو میاں کو اپنی بیوی یاد آئی۔

"نیک بخت، وہ تو اللہ میاں کی گائے تھی" شرفو میاں نے سوچا "ساری زندگی ہر طرح کے عیش و عشرت کے باوجود اُن کا ہر کام اُس نے خود کیا یا اپنی نگرانی میں کرایا۔ کسی نامحرم نے اُس کا سایہ تک نہ دیکھا تھا۔ پالکی میں سوار ہوتی تو دونوں جانب پردے تانے جاتے اور چپکے سے کسی بچے کو ساتھ بٹھا لیتی تاکہ کہار وزن کا اندازہ نہ کر سکیں۔ حد تو یہ ہے کہ ٹرین میں بھی سوار ہوئی تو پردے کا اسی طرح اہتمام ہوا۔ مرگئی مرنے والی۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ اچھا ہی ہوا۔"

پھر شرفو میاں کو کھلینڈرے اور اپنے باغ کے آم یاد آ گئے۔

"آم اور جامنوں کا کتنا شوق تھا مرحومہ کو۔ بڑے چاؤ سے باغ لگوائے اور پھر ہر آم کا الگ الگ نام رکھا۔ سفیدا۔ ہلدیا۔ بڑا امبا۔ راج بالم۔ جوگیا۔ اللہ قدرتی بنارسی۔ آہ! کیا زمانہ تھا۔ زندگی گویا اپنے بس میں تھی جس طرح چاہو برتو۔ وقت گویا اشارے کا منتظر رہتا۔ اور اب کیا زمانہ آ گیا ہے۔ زندگی ہے کہ گزرے جا رہی ہے۔ وقت ہے کہ بھاگا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا ہے کہ زندگی اپنی ہے نہ وقت اپنا۔"

نیچے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر گیلری روشن ہوگئی۔

"شاید ساجد آٹھا ہے" شرفو میاں بڑبڑائے۔

ساجد اُن کا بیٹا ٹیلیفون کے محکمے میں افسر تھا اور اسے انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم دلوائی تھی۔ لیکن اب شرفو میاں کو محسوس ہوتا جیسے اُن کے بڑھاپے اور ساجد کی جوانی نے باپ بیٹے کے درمیان اجنبیت کی خلیج حائل کردی ہو۔ شاید بوڑھے باپ کے لئے جوان بیٹوں کے منہ لگے ہی رہتے ہوں گے۔ کچھ ایسا ہی چلن ہوگا۔ انہوں نے ساجد کا کیا بگاڑا تھا وہ تو کسی معاملے میں دخل تک نہ دیتے تھے۔ اپنی پسند اور ناپسند کا سلسلہ بھی ترک کر چکے تھے۔ انہیں ہر وہ چیز پسند تھی جو اُنہیں دے دی جائے۔ زندگی بھر سگریٹ پیتے رہے اب جب بیٹے کے ساتھ رہنا پڑا تو کبھی سگریٹ آتی کبھی ساجد کو خیال نہ رہتا۔ بالآخر انہوں نے کھانسی کا بہانا کرکے سگریٹ چھوڑدی۔ شروع شروع میں اپنی شخصیت تشنہ اور نامکمل محسوس کرتے رہے پھر انہوں نے شخصیت کے اس بُت کو درگذر کے تیشہ سے چور چور کردیا۔ انہوں نے اپنی نفی کرنے والے ہر سانحہ کو خدا کی مصلحت کا نام دے کر قبول کرلیا اور آخرکار اُن کی شناخت اُن کے بیٹے کے وسیلے سے ہونے لگی اور وہ دل ہی دل میں مُسکراتے۔

"لو بھئی اب باپ کو بیٹے کے نام سے روشناس کرایا جاتا ہے" وہ اپنے آپ سے کہتے۔

"یہ اپنے ساجد صاحب کے والد ہیں"

"صاحب کے ابا جی ہیں"

اپنا نام گیا اپنی شناخت گئی۔ کاغذ کی چندیوں کی طرح شرفو میاں بے وزن اور بے وقعت ہوگئے۔

شرفو میاں نے جس گاؤں میں آنکھ کھولی تھی اور جس سماج سے ٹوٹ کر بکھرے تھے اس کی قدریں آج بھی اُن کے بوڑھے ذہن میں محفوظ تھیں۔ گاؤں کے ماحول کا رکھ رکھاؤ انہیں پھر کبھی میسر نہ آیا۔ گاؤں میں جاننے والوں کے علاوہ کوئی اجنبی بھی اُن کے سامنے سے گزرتا تو "سلام جی" کا نذرانہ ضرور پیش کرتا۔ یہاں اُن سے صرف "سلام جی" کا نذرانہ ہی نہ چھنا تھا بلکہ سلامتی کا ہر راستہ اُن پر مسدود ہوچکا تھا۔

شرفو میاں نے گہری سانس لی اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک گھٹی گھٹی سی چیخ اُن کے سینے کے کسی گوشے سے اُبھری اور سینے ہی میں دم توڑ کر رہ گئی۔

دسمبر کی رات چپ چاپ گزر رہی تھی۔

"کتنی زندگی تھی ہر چیز میں" شرفو میاں نے اپنے آپ سے کہا

دھان کے چھوٹے چھوٹے پودے بی یاڑ سے نکال کر کھیتوں میں لگائے جا رہے تھے۔ آسمان پر بادل لدے کھڑے تھے۔ سرمئی، سبزی مائل، اودے اور کالے جھومتے تہہ در تہہ بادل، اور کھیتوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی بھرا ہوا تھا اور لڑکیاں بوڑھی اور جوان عورتیں لہنگے گھٹنوں سے اوپر تک سمیٹے دھان لگا رہی تھیں۔ تازہ لگائے ہوئے پودے گدلے پانیوں میں نڈھال سے پڑے ہوئے تھے۔ دھان لگ رہے تھے اور بھیگی بھیگی ہواؤں میں گیت گونج رہے تھے۔

"مور چنریا بھیگی جائے
چنریا بھیگی جائے
سیاں مارو نہ پچکریا
مور چنریا بھیگی جائے۔

دھان لگاتے ہوئے لڑکیاں جب قدم آگے بڑھاتیں تو اُن کی کھری کھری برہنہ پنڈلیاں اس طرح سنی ہوتیں جیسے انہوں نے کیچڑ کے موزے پہن رکھے ہوں۔ آپس میں چہلیں کرتی ہوئی جب ایک دوسرے پر پانی کی چھینٹیں اچھالتیں تو اُن کے گداز جسموں سے اوڑھنیاں ڈھلک جاتیں اور انہیں پرواہ تک نہ ہوتی۔ معصوم سادہ چہرے، سچی خوشیاں اور زندگی سے بھرپور قہقہے نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ پھلیندے، آموں کی بالیں اور ہلکی ہوا میں سرسراتے ہوئے کومل پودے سب خواب ہو گئے۔

"دھان کے کھیت جل گئے۔ گیت بھی جل گئے۔ میرے لئے تو جل ہی گئے۔" شرفو میاں نے سوچا۔

حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن کی نظروں سے دور اب بھی بادل اُمنڈ کر آتے ہوں گے، دھان کے پودے اب بھی لگتے ہوں گے اور فضا میں وہ سارے گیت اب بھی

گونج رہے ہوں گے۔

"یہ کیا ہو گیا۔ میرے کھیت، میرے گیت، میرے لوگ" ان کے سینے پر ایک گھونسہ سا لگا۔ سامنے کھولی کی پیلی روشنی میں چوکھٹ سے لگی بیٹھی رتیماں نے جیسے گھٹن کا احساس اور شدید کر دیا ہو۔

انہوں نے سوچا۔

"یہاں ان اونچی سنگلاخ عمارتوں میں جیسے زندگی محبوس ہو، ان میں رہنے والوں کے دم گھٹ کیوں نہیں جاتے۔ یہ لوگ کس طرح زندہ ہیں۔ زندگی تو انہیں چھو کر بھی نہیں گئی۔ یہ اپنے گھروں کو مسجدوں کی طرح سجا دیتے ہیں۔ یہ عبادت خانوں جیسے گھر جہاں پاؤں پھونک پھونک کر رکھنے پڑتے ہیں ذرا سے چوکے اور چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔ کہیں غافل ہوئے اپنی کیٹ کا بت ریزہ ریزہ ہو گیا۔ ذہن کہیں دل کہیں لیکن چہرے پر شوکیس میں سجی گڑیوں جیسی مسکراہٹ چپکی ہوئی ہے۔ ان اونچی سنگلاخ عمارتوں کے اندر جیسے سب سچائی کے خلاف سازشیں کر رہے ہوں۔ لکھاوری اینٹوں کی سچی کشادہ حویلیو اور کچی دیوارو اور پھوس کی چھتوں والے غمگسار گھروندو تمہارے یہاں زندگی یکساں تھی، غم یکساں تھے اور خوشیاں یکساں تھیں، تمہارے مکینوں کے چہرے شوکیسوں میں نہیں سجے ہوئے تھے۔"

انہیں گاؤں کا محرم یاد آ گیا۔ کاندھوں پر آہستہ آہستہ ڈولتے ہوئے تعزیے یاد آ گئے۔ گاؤں میں محرم کی تیاریاں بڑے زور و شور سے ہوا کرتی تھیں۔ مہینوں پہلے سے تعزیہ بننا شروع ہو جاتا۔ علم کے لئے کپڑے لائے جاتے انہیں بنایا ٹانکا جاتا۔ نوحوں کا انتخاب ہوتا، ان کی لحن بنائی جاتی اور ریہرسل ہوتی اور محرم کا چاند نکلتے ہی بڑے امام باڑے پر ماتم اور نوحے شروع ہو جاتے۔ انہیں ایک ایک کر کے محرم کی پہلی سے دسویں تک کا ایک ایک لمحہ یاد آیا۔ تعزیے کے سامنے پنڈتوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کے جڑے ہوئے ہاتھ یاد آ گئے۔ جے جے کے نعرے یاد آ گئے۔ تعزیے پر چڑھاوے چڑھاتی اور منتیں مانگتی ہندو عورتیں اور کندن کی طرح دمکتے چہرے والی لڑکیاں یاد آ گئیں، اس وقت ان کے چہروں پر پاکیزگی کا نور ہوتا اور ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ سری کرشن کی مرلی کی مدھر تان پر آرتی اتار رہی ہوں، پوجا کے گیت

گا رہی ہوں۔

"یہ اچانک نفرت کا سیلاب کیسے اُمنڈ آیا"

شرفو میاں اس کے آگے کچھ نہ سوچ سکے گزری ہوئی یادوں کی خلش پلکوں پر آنسو بن کر لرزنے لگی۔ لمحوں کا درد ہونٹوں پر کرب بن کر کانپنے لگا۔ ان یادوں میں تلخیاں تھیں اذیت تھی۔ محبتیں فنا ہو چکی تھیں اور نفرت اُن کا مقدر ہو چکی تھی۔ چہیتوں کے پیار نہ جانے کہاں گم ہو چکے تھے۔ وہ زمین ہی نہ رہی تو چہیتوں کے پیار کی جڑیں کہاں پھیلتیں۔ زمین نہ تھی اس لئے سارے جذبے ہوا میں معلق ہو گئے۔

نیچے گیلری میں روشنی گل ہوئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ شرفو میاں نے مڑ کر گیلری کی طرف دیکھا ساجد نے دروازہ بند کر رکھا تھا اور وہاں گھپ اندھیرا تھا۔

"ساجد بچپن میں کتنا ہنس مکھ اور معصوم تھا۔ لیکن اب تو اس کے چہرے پر اجنبیت کی گہری لکیریں پڑ گئی ہیں۔"

شرفو میاں نے ساجد کی شادی کے بڑے منصوبے بنائے تھے۔ کئی لڑکیاں منتخب کیں اور پھر اُن کی خوبیاں اور خامیاں دل ہی دل میں شمار کیں۔ لیکن ساجد نے ایک دن چپ چپاتے اپنی شادی کر لی اور شرفو میاں سے رسماً بھی تذکرہ نہ کیا۔ انہیں جب بہو آ گئی تو علم ہوا کہ اُن کے بیٹے کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے چھوٹے سے زینے کے قریب والے کمرے میں روتے رہے اور ساجد کی ماں کو یاد کرتے رہے۔ جیسے کوڑے میں پڑی ہوئی سڑی گلی اشیا سے ہلکی ہلکی باس اُٹھ رہی ہو۔ انہوں نے اُس دن یہ بات شدت سے محسوس کی کہ اُن کا وجود گھر میں کسی بیکار چیز کی طرح ہے۔ اُس دن گلدانوں میں نئے پھول سجائے گئے۔ نئے پردے ڈالے گئے۔ ڈرائنگ روم کی ترتیب بدلی گئی۔ نیا پینٹ ہوا۔ دیوار میں لگے ہوئے کلاک کو جھاڑا پونچھا گیا۔ لیکن شرفو میاں کے گالوں پر مستقل بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھنے والا کوئی نہ تھا وہ اسی طرح ماہ و سال کی گرد میں اَٹے سسکیاں لیتے رہے۔ ساجد کو اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ بہو کو لے کر سلام کے لئے ہی اُن کے سامنے آ جاتا۔

شرفو میاں کی بہو کیا آئی بھونچال آ گیا۔ اچھا بھلا گھر کلب میں بدل گیا۔ دن بھر گھر میں

میوزک ہوتی اور بہو تھرکتی رہتی اور شام کو ساجد کے دوست اور بہو تفریح کے لئے نکل جاتے۔ گئی رات کو واپس لوٹتے تو ڈرائنگ روم میں دوستوں کے ساتھ کافی پیتے، رمی کھیلتے اور سو جاتے۔ دوستوں کی تعداد اتنی بڑھی کہ انہیں اپنی بہو شہد کا چھتہ نظر آنے لگی۔ لیکن وہ خاموش سڑک کے کنارے گڑے ہوئے سنگِ میل کی طرح ہر آنے جانے والے کو دم سادھے دیکھتے رہے۔ اس کے باوجود انہیں محسوس ہوتا کہ اُن کا پتھر کی طرح ساکت وجود ساجد کے چہرے پر سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے گھر میں اپنے آپ کو بن بلایا مہمان محسوس کرتے۔

"ساجد میرا بیٹا مجھ سے کتنی دور ہے" وہ اکثر سوچا کرتے۔

شرفو میاں کو بہو سے یوں تو بے شمار شکایتیں تھیں لیکن اس کے گداز جسم پر چپکی ہوئی چست اونچی جمپر جس کے گلے عام طور سے اتنے کشادہ ہوتے کہ سینے کے ابھار نظر آسکیں، اور کمر کے خم واضح ہوں، دیکھتے تو انہیں گھن آتی۔ وہ جب اُن چست گوشت میں کھبے ہوئے جمپروں میں چلتی تو اس کے آپا دھاپی کرتے ہوئے کولھے شرفو میاں کو منہ پھیر لینے پر مجبور کردیتے۔ اُنہیں بہو سراپا برہنہ محسوس ہوتی۔ انہیں ایسا لگتا جیسے اُن کی بہو اپنے جسم کے خطوط کی شعوری طور پر نمائش کرتی ہے۔ پھر آزادی کا یہ عالم کہ وقت بے وقت ساجد کے دوست بہو سے ملنے آتے رہتے خواہ ساجد گھر میں موجود ہو یا نہ ہو۔ دوستوں کی آمد بدستور جاری رہتی اور ڈرائنگ روم کے بھاری پردوں کے پیچھے قہقہوں اور سرگوشیوں کے ساتھ کپڑے سرسراتے رہتے اور پُراسرار خاموشی طاری ہوجاتی۔ ایسے موقعوں پر انہیں یہ گھر گھر نہ معلوم ہوتا۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ گوشت کی منڈی میں کھڑے بیوپاری ہیں۔ انہیں اپنے آپ پر شرم آتی لیکن اُن کے لب سلے ہوئے تھے۔ سڑک کے کنارے گڑے ہوئے سنگِ میل کی طرح ہر آنے جانے والے کو چپ چاپ دیکھا کرتے۔

عین اس لمحے جب کہ ساجد نے دروازہ بند کرلیا تھا اور گیلری میں گھپ اندھیرا تھا۔ ساجدہ کی یاد ایک نشتر کی طرح شرفو میاں کے سینے میں اُترتی چلی گئی۔ مایوسی کے عالم میں انہوں نے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا۔ ننھے ننھے ان گنت تارے حدِ نگاہ

تک پھیلے ہوئے تھے اور یادوں کے جزیرے میں جگنو واقعات کی منتشر کڑیاں لئے ذہن میں چمک رہے تھے۔ انہیں اس ماحول میں اپنا وجود کسی طرح موزوں نظر نہ آتا تھا جیسے کسی ڈوبے ہوئے جہاز کا کوئی شکستہ تختہ لہروں کے رحم و کرم پر تیرتا پھر رہا ہو۔

ساجدہ کی یاد کے ساتھ سینے میں درد کی ایسی ٹیسیں محسوس ہوئیں کہ شرفو میاں کے جسم سے۔ جیسے کسی نے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہو۔

یہاں آنے سے قبل ساجدہ ننھی منھی گڑیا جیسی تھی۔ معصوم، شگفتہ، بھولی بھالی ساجدہ جب بولتی تو پھول جھڑتے، خاموش ہوتی تو تصویر بن جاتی۔

جب شرفو میاں گاؤں سے چلے تو انہیں حویلی کی بے جان چیزیں بولتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ برسوں انہوں نے اِن اشیاء کو برتا تھا۔ انہیں حویلی کا ذرہ ذرہ سوال کرتا محسوس ہو رہا تھا۔

"تم ہمیں کس پہ چھوڑ چلے۔"

"ہم نے تمہیں شدید موسموں سے محفوظ رکھا ہے۔ تمہیں سکھ دیئے ہیں۔ تمہارے دکھوں میں شریک رہے ہیں۔"

"تم ہمیں کس پر چھوڑ چلے میاں"

جب شرفو میاں نے امام ضامن باندھ کر حویلی کی بڑی ڈیوڑھی سے قدم باہر نکالا تو پانی بھرنے والی مجیدن، جھاڑو دینے والی شبراتن، جانوروں کو چارہ دینے والا رام جیونا اور خاکروب رم زنتا سب آنکھوں میں آنسو لئے کھڑے تھے۔

"ہمیں کس پر چھوڑ چلے میاں" سب نے ایک زبان ہو کر کہا اور شرفو میاں کو یہ آواز اس طرح سنائی دی۔ جیسے حویلی کے دَر و دیوار کو زبان مل گئی ہو۔ اُن کا جی چاہا کہ وہ واپس حویلی میں مڑ جائیں اور بام و دَر سے لپٹ کر رو لیں اور کہدیں کہ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اپنی روح کے ریزے ریزے کس طرح کر سکتا ہوں لیکن سارے گاؤں کے لوگ جو اُن کو رخصت کرنے آئے تھے اُن کے منتظر کھڑے تھے۔ آگے آگے شرفو میاں چل رہے تھے اور پیچھے پیچھے گاؤں کے چھوٹے بڑے سب ہی لوگ سر جھکائے

آبدیدہ اُنہیں گاؤں کے بازار تک رخصت کرنے جارہے تھے۔

"جنازہ جارہا ہے"

یہ لوگ کسی کو دفنانے قبرستان جارہے ہیں"۔

"کون مرگیا ہے!"

ہر موڑ پر گاؤں کی گلیاں، مکانات، عورتیں، بچے، ذرہ ذرہ جیسے چیخ کر پوچھ رہا ہو

"کیا جنازہ جارہا ہے"۔

"یہ لوگ کس کو دفنانے جارہے ہیں"

"کون مرگیا ہے"۔

"لوگو شریف الدین خان مرگیا ہے" شرفو میاں نے چیخ کر کہا لیکن اُن کی آواز اُن کے رندھے ہوئے گلے سے نہ نکل سکی اور سسکی بن کر رہ گئی۔ شرفو میاں حویلی کے در و دیوار گاؤں کی گلیوں اور بازار، کھیتوں میں لہلہاتے پودوں، آم، جامن، مہوے، کٹھل، شریفے اور کیتھوں کے درختوں اور گاؤں والوں سے نظریں چرا کر اپنے سر ان سب سے بے وفائی کا الزام لے کر اور اپنا نام و نسب ہمیشہ کے لئے دے کر گاؤں سے نکل گئے۔ ساجدہ کی ماں مرچکی تھی، ساجد ان سے دور تھا اور اس نے ہی شرفو میاں کو اپنے پاس بلایا تھا چنانچہ شرفو میاں اتنی بھری پُری دنیا سے ایک ساجدہ کو لے کر چل کھڑے ہوئے۔

ننھی ساجدہ بے حد خوش تھی ٹرین میں بیٹھتے ہی اس نے پوچھا۔

"ہم بھیا کے پاس کب پہونچیں گے"

شرفو میاں نے ننھی ساجدہ کی خوشی دیکھی اور اُن کا دل بھر آیا اور ٹرین میں بیٹھے ہوئے پلیٹ فارم کی چیزوں کو گھورنے لگے۔ پرانے رشتے ٹوٹ رہے تھے۔ اُنہیں معلوم تھا کہ یہ اسٹیشن، ترپالوں کے نیچے ڈھکی ہوئی غلّے کی بوریاں، اسٹیشن سے باہر جانے کا آہنی گیٹ، مٹی کے تیل کے لیمپوں پر لال رنگ سے لکھا ہوا اسٹیشن کا نام، پلیٹ فارم پر بھاری سامان لے جانے والے ریڑھے، ویٹنگ روم، ہندو پانی اور مسلمان پانی کے مٹکے اور پلیٹ فارم کے سِروں پر پتھر کی سِلوں پر اسٹیشن کا نام اور چابک ہاتھوں میں

پکڑے شور مچاتے ہوئے بکنے والے وہ دوبارہ نہ دیکھ سکیں گے۔ اس سے پہلے انہوں نے سینکڑوں مرتبہ اس اسٹیشن سے سفر کیا تھا مگر آج تو بات ہی کچھ اور تھی۔

پلیٹ فارم پر غلیظ چھوکرے پتوں کے بنے ہوئے دونوں میں جامن لئے ہوئے ان کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

"پھلیندے۔ میٹھے پھلیندے"

ٹوکری میں لڑکے آم لے کر آگئے۔

"پال کے آم۔ میٹھے آم"

ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ آموں کی ٹوکریاں اور جامن کے دونے، چاپک پکڑے ہوئے شور مچاتے بکنے والے، جگہ جگہ لکھا ہوا اسٹیشن کا نام، ہندو پانی، مسلمان پانی سب دھندلا گئے۔ سارے جانے پہچانے چہرے دھندلے ہوتے چلے گئے۔ ساجدہ طرح طرح کے سوالات کئے جارہی تھی، ٹرین جارہی تھی۔ سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔

صبح جب شرفو میاں کی آنکھ کھلی تو ٹرین ایک بڑے اسٹیشن پر کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن اس اسٹیشن میں ان کے گاؤں جیسے اسٹیشن کی فضا نہیں تھی۔ جگہ جگہ اسٹیشن کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ باہر جانے کا آہنی گیٹ بھی تھا۔ ویٹنگ روم بھی تھا۔ ہندو پانی اور مسلمان پانی کی تختیاں بھی تھیں۔ آم بھی تھے مگر فضا بالکل مختلف تھی زبان مختلف تھی لباس مختلف تھے۔ شرفو میاں کی اپنی تہذیب کا اب کوئی نشان نہ تھا۔

"صرف ایک رات میں دنیا اتنی بدل گئی" شرفو میاں نے سوچا

"میری تہذیب کہاں ہے۔"

"میری زبان کہاں ہے۔"

"میرے لوگ کہاں ہیں۔"

"اب کچھ بھی نہیں ہے شرفو مر گیا۔ شرفو مر گیا۔"

وہ لونہی بڑبڑاتے رہے اور انجن سائیں سائیں کرتا رہا

ریشماں کی کھولی میں زرد روشنی اب بھی کانپ رہی تھی۔ سارا علاقہ پر سکون

تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔

جب ساجدہ کا داخلہ کانونٹ میں ہوا تو انہیں اعتراض کرنا پڑا مگر ساجد اور ساجدہ کے پاس تعلیم نسواں کے حق میں مضبوط دلائل تھے۔ شرفو میاں یہ جانتے تھے کہ تعلیم نسواں کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پہلے دوپٹے گلے سے نکال کر پھینک دیئے جائیں۔ نئے سماج کی قدریں اُن کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ لیکن اُن کی سنتا کون تھا۔ انہیں بہت پہلے علم ہو چکا تھا کہ وہ بے کار اشیا کے ڈھیر میں پھینکے جا چکے ہیں۔

"آم چھو۔ آم چھو۔ کوڑی بادام چھو"

شرفو میاں کو ایسا لگا جیسے ننھی ساجدہ آم چھو، کوڑی بادام چھو، کھیلتی ہوئی اُن کے سامنے کھڑی ہوئی ہو۔ آہستہ آہستہ اُس کا قد بڑھا، چہرہ بدلا اور ننھی ساجدہ اچانک جوان ہوگئی، وہی پونی ٹیل، چست لباس اور جسم کے نمایاں خطوط۔

وہ یادگار دن تھا۔ ساجدہ نے سفید کڑھے ہوئے کرتے کے نیچے کالے رنگ کی چولی پہن رکھی تھی۔ اُس دن چھٹی تھی اور رہو اور ساجدہ دونوں نے صبح ہی سے ناخنوں کو سنوارا تھا، ان پر پالش کی تھی، کپڑوں کا انتخاب کیا تھا اور بالوں کے ڈیزائن منتخب کئے تھے۔ ساجد غالباً کام کے غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے آج بھی دفتر گیا ہوا تھا۔ ان سب کو آج پکنک پر جانا تھا۔ شرفو میاں سب کچھ چپ چاپ دیکھتے رہے۔ جب ساجد نہ آیا اور رہو اور ساجدہ دونو جوانوں کے ساتھ بغیر ساجد کا انتظار کئے روانہ ہونے لگیں تو انہوں نے ساجدہ کو آواز دی۔

"ساجدہ دی اولڈ مین"۔ رہو نے کہا

ساجدہ شرفو میاں کے کمرے میں داخل ہوئی تو "ان ٹی میٹ" کی خوشبو سے کمرہ مہک گیا۔ دو بدھیوں والی نازک سی چپل میں ساجدہ کے خوبصورت پیر، سفید براق گھیر والی شلوار، کڑھا ہوا کرتا، سیاہ چولی، کمر کے نیچے تک کھلے ہوئے سیاہ بال اور کڑھے ہوئے کرتے سے چھنتا ہوا دودھیا جسم اور کرتے کے کھلے ہوئے بٹنوں کے نیچے ننھے ننھے خوبصورت دائرے اور ساجدہ کے چہرے پر ہلکے غازے کے نیچے کلیوں کا کچا پن۔

"جی۔" ساجدہ نے کہا اور اِن ٹی میٹ کے ساتھ ساجدہ کی سانسوں کی خوشبو بھی شامِل ہوگئی۔

شرفو میاں کو شرم آئی اور اُن کا جی چاہا کہ وہ یوں ہی زمین میں گڑ جائیں۔

"یہ میری بیٹی ساجدہ ہے جو میرے ہی سامنے اپنے خوبصورت جسم کی دوکان سجائے برہنہ کھڑی ہے۔"

"جی ابا میاں" ساجدہ نے دوبارہ کہا۔

شرفو میاں کی زبان گنگ ہو گئی۔ بیٹی سے کیا کہتے۔

"کچھ نہیں" شرفو میاں نے جواب دیا۔

"میں بھابھی کے ساتھ پکنک پر جا رہی ہوں۔"

"اب وقت گزر چکا ہے" شرفو میاں نے اپنے آپ سے کہا۔

"ابھی تو بہت وقت ہے۔ دس بھی نہیں بجے۔"

شرفو میاں سوچتے رہے

"بیٹی یہ پکنک "

"ابا میاں، یہ پکنک۔ ہاؤ ونڈرفل۔ اِٹ اِز سو ایکسائٹنگ۔ سی بریز میں ماؤتھ آرگن۔ کیقباد بہت خوبصورت ماؤتھ آرگن بجاتا ہے۔"

"کیقباد کون ہے"

"میرا کلاس میٹ۔ کہتا ہے فلموں میں ہیرو آؤں گا۔"

"ساجدہ بھئی اب آ بھی چکو۔ اِٹ اِز لیٹ ناؤ" بہو کی آواز آئی اور ساجدہ کمرے سے بھاگ گئی اور شرفو میاں کچھ کہنے اور نہ کہنے کی کشمکش میں آخری غچہ کھا گئے۔

شبنم سے شرفو میاں کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ سرد ہوا اب اُن کے جسم میں چبھ رہی تھی۔ دسمبر کی رات ڈھلنے کو آئی ننھی تارے قریب آتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

شرفو میاں کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ساجدہ کی وہ آخری پکنک تھی اُس کے اچانک غائب ہو جانے پر ساجد خاموش رہا۔ بہو کچھ بھی نہ بولی اور شرفو میاں کو چند دنوں تک

زندگی کا بھی احساس نہ رہا۔ ساجد کو ساجدہ کے جانے کا غم کم اور بات پھیل جانے کا خوف زیادہ تھا۔

"میری خاموشی ساجدہ کو کھا گئی" شرفو میاں بڑبڑائے۔

ساجدہ گھر سے چلی گئی لیکن بہو کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی طرح سے ڈرائنگ روم میں دوستوں کے ساتھ سرگوشیاں کرتی رہی۔ اسی طرح پکنک کا پروگرام بنتا۔ ساجد بھی نارمل ہوگیا تھا۔ صرف شرفو میاں روتے رہے۔ بہروں روئے۔ پھر ان کی آنکھوں میں بھی آنسو خشک ہوگئے۔ انہوں نے چپ سادھ رکھی تھی سو خاموش رہے ساجدہ کی تو اتنی بھی تلاش نہ ہوئی جتنی گرے ہوئے چھوٹے سے چھوٹے سکے کی ہوتی ہے۔

ریشماں کی کھولی کی روشنی غائب ہوچکی تھی۔ دور کسی کھولی کے اندر سے مرغ کی آواز سنائی دی اور مسجد سے مؤذن کی آواز بلند ہوئی۔

دسمبر کی رات گزر چکی تھی۔

صبح ہوگئی تھی۔

شرفو میاں سیڑھیوں سے نیچے اترے ان کی ٹانگیں اکڑی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ جوتے کے اندر انگلیاں سن ہوگئی تھیں۔ جسم پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں۔

دوسری رات شرفو میاں نے ریشماں کی کھولی کے سامنے سے گزرتے ہوئے پھر سوچا۔

"عجیب عورت ہے۔ تنہا۔ اداس اور منتظر۔ اسے کس کا انتظار ہے۔"

شرفو میاں کو ریشماں کی تنہائی اور بے چارگی سے ایک طرح کی طمانیت محسوس ہوئی۔ اس بھری دنیا میں وہ ہی تنہا اجنبیت کے شکار نہیں تھے۔ یہ بڑھیا جو اپنی کھولی کی چوکھٹ سے لگی زنگ آلود لالٹین کی روشنی میں ساری رات تنکے توڑا کرتی ہے ان سے زیادہ تنہائی اور اجنبیت کی ماری ہوئی ہے۔ شرفو میاں کو ریشماں سے گہری ہمدردی ہوگئی۔ ریشماں بھی تنہا ہے اور وہ بھی ناپسندیدہ اور بے کار شئے کی طرح

کوڑے کے ڈھیر میں پڑی ہوئی ہے۔

رات کے کوئی گیارہ بجے تھے۔ سارے نمازی مسجد سے جا چکے تھے۔ راستہ ویران پڑا ہوا تھا۔ شرفو میاں ٹیلیفون ایکسچینج کی پیلی عمارت کی طرف جاتے ہوئے ریشماں کی کھولی کے سامنے رُک گئے۔ ریشماں حسبِ معمول چوکھٹ سے لگی بیٹھی ہوئی تھی۔ اندر کھولی میں لالٹین جل رہی تھی۔ ریشماں نے شرفو میاں کو ہمیشہ کھولی کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ آج وہ وہاں رُکے تو ریشماں نے انہیں مخاطب کیا:

"مولانا جی. سلام علیکم"

"وعلیکم السلام"

"کیا بات ہے مولانا جی"

"کچھ نہیں۔ بس یونہی جی میں آئی کہ تمہاری خیریت معلوم کرلوں"

"مہربانی مولانا جی۔ ہماری خیریت کیا۔ اور اس کا پوچھنا کیا۔ آپ کی بڑی مہربانی آیئے اندر آجایئے۔ یہ جگہ آپ لوگوں کے لائق تو نہیں پر میری عزت بڑھ جائے گی۔۔ آجایئے نا۔"

شرفو میاں کھولی کے اندر چلے گئے۔

"کئی بار سوچا کہ تم سے پوچھوں" شرفو میاں بانس کی واحد چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولے

"کیا مولانا جی"

"تم تمام رات کھولی کی چوکھٹ سے لگی کیوں بیٹھی رہتی ہو۔ تمہیں نیند نہیں آتی کیا۔ یا بیمار رہو"

ریشماں چارپائی کے قریب لگی ہوئی تپائی پر بیٹھ گئی۔ اُس مدھم روشنی میں اُس کا چہرہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن جب اُس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو اس کے گالوں پر آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے۔ شرفو میاں نے ریشماں کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیر دیکھی اور پہلو بدل کر کسمسا کر رہ گئے۔ تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہے پھر ریشماں بولی تو اس کی آواز صاف اور پُر اعتماد تھی۔

"مولانا جی میں رات کو بالکل نہیں سوتی۔ سو ہی نہیں سکتی۔ میری زندگی میں دن بہت تھوڑے ہیں۔ میرے حصے میں تو صرف رات آئی ہے۔ طوائفوں کی زندگی میں دن بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ اُن کے حصے میں صرف راتیں آتی ہیں۔ پیشہ کرنے والی عورتوں کی زندگی میں دن چند ھیا دینے والے اور تکان اتارنے کے لئے ہوتے ہیں۔ اور راتیں اوروں کے اشارے پر گزارنے کے لئے آتی ہیں۔ اُس کے اپنے نہ دن ہوتے ہیں نہ راتیں۔ لوگ خریدے ہوئے مال کو اپنی مرضی کے مطابق برتتے ہیں۔ مولانا جی یہ کام بڑی ہتہ ماری کا ہے۔ ہمارے گاہک مرچ اور ہلدی سے لے کر شراب اور پسینے کی بو اپنے ساتھ لائے ہیں۔ بات کریں تو آس پاس سڑے ہوئے گوشت کی بساند پھیل جائے مگر ہم خریدا ہوا مال اُن سڑی بسی گٹھڑیوں میں چپ چاپ بند ہو جاتے ہیں اور دم گھٹے تو اُف تک نہیں کرتے۔"

شرفو میاں سکتے میں آ گئے۔

ریشماں لالٹین کی زردی مائل بتی کو جلتا ہوا دیکھتی رہی۔

"آپ چپ ہیں۔ چھتا رہے ہوں گے کہ طوائف کی کھولی میں کیسے آ گئے۔ لیکن اب اس کھولی میں طوائف نہیں رہتی۔ طوائف کا بھیانک مستقبل رہتا ہے۔ اُس کے پچھتاوے رہتے ہیں۔ یہاں چٹخی ہوئی ہڈیاں اور نچا ہوا گوشت پڑا ہوا ہے۔ مولانا جی میں اب بوڑھی ہو چکی ہوں۔ کتنی سالوں سے میرے بستر پر کوئی گاہک نہیں آیا۔ نہ پھولوں کے ہار مہکے ہیں نہ شراب کی بو پھیلی ہے۔ اب میرا کوئی نہیں۔ جوانی کے ہنگامے بیت گئے۔ اب میں تنہا ہوں۔ ویران ہوں کھنڈر ہوں۔ اب میرا کوئی نہیں۔"

شرفو میاں کچھ نہ بولے۔

"لیکن مولانا جی ذرا آپ پاؤں اُٹھا کر بیٹھ جائیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی میری باتیں سن لے۔ میں ساری رات جن زخموں کو کرید کر لہولہان ہوتی رہتی ہوں میرا جی چاہتا ہے کوئی تو انہیں دیکھ لے۔ جوانی میں یہ زخم اتنے گہرے نہ محسوس ہوتے تھے نہ کسی کو اتنی فرصت تھی۔ اب کھولی کہ ان خاموش دیواروں کے علاوہ میری سننے والا

کوئی نہیں۔ میری باتیں سن لیں شاید میرا جی ہلکا ہو جائے۔ آپ دوبارہ تو اس کھولی میں خیر کیا آئیں گے۔"

"کہو میں سنوں گا" سنتر فو میاں نے کہا۔

"مجھے اب یہ بات خواب سی لگتی ہے کہ میرا بھی کوئی گھر تھا۔ میرا بھی کوئی گاؤں تھا۔ چھوٹا سا ہرا بھرا گاؤں۔ جہاں میں نے سکھیوں کے ساتھ گیت گائے تھے۔ گلیوں میں چھوٹی چھوٹی شرارتیں کی تھیں، اَن گنت کھیل کھیلے تھے۔ میری ہنس مکھ اور معصوم ذرا ذرا سی بات پر شرما جانے والی سکھیاں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر رُوٹھ کر کئی کئی دن روٹھی رہنے والی سہیلیاں۔ میرا چھوٹے سے صحن کا صاف ستھرا مکان تھا۔ میرے بابا کے پاس زمینیں تھیں، جانور تھے۔ کاش یہ سب کچھ خواب ہی ہوتا، یا یہ زندگی جو اب بیت رہی ہے۔ ایک طویل اور بھیانک خواب ہوتی۔"

"مولانا جی" ریشماں تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولی تو اُس کی آواز بھرا گئی تھی۔ "مولانا جی جب اپنا گھر یاد آتا ہے، گاؤں یاد آتا ہے، سہیلیاں یاد آتی ہیں اور بابا یاد آتے ہیں تو میرے سینے میں ایک ہوک سی اُٹھتی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ایک ایسا پرندہ ہوں جس کے پر کتر کر بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہو۔ سوچتی ہوں اُن گزرے ہوئے دنوں کو اپنی زندگی سے کس طرح نکال کر پھینک دوں جنہوں نے مجھے ریشماں بنا دیا۔ گاؤں کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے چمکدار دن اور گیتوں بھری مہکتی ہوئی راتیں اللہ جی بھی میری جھولی میں نہیں ڈال سکتے۔ کیوں مولانا جی کیا ایسا ہو سکتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

سنتر فو میاں کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئے۔

"جب بہار آتی" ریشماں اس طرح بول رہی تھی جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ "جب بہار آتی اور کھیت سرسوں کے پھولوں سے پیلے ہو جاتے تو ایسا لگتا جیسے ہرے ہرے پودوں نے سروں پر پیلی اوڑھنی اوڑھ لی ہو۔ اور جب پیلو پیڑوں میں مہکنے لگتے تو جسموں میں گدگدی سی بھر جاتی۔ بجلیاں سی کوندنے لگتیں۔ پھر ہمارے گیت گاؤں کی

خاموش فضا میں اس طرح گونجتے جیسے پریاں پَر ہلا رہی ہوں۔ راتیں بیدار ہوجاتیں اور تاروں کی چمک بڑھ جاتی اور سکھیاں اپنے چہنتوں کو یاد کرتیں۔"

نک سونے دی رکل ماہیا
لوکاں دیاں روندڑا انکھیاں
ساڈا روندا اے دل ماہیا

کھیتوں میں، پنگھٹ پر اور جھولوں میں ہر جگہ کنواریوں کے گیت گونجتے رہتے۔ ایسا لگتا جیسے حوریں چاندی کی گھنٹیاں بجا رہی ہیں۔ ہمارے گلے میں لوچ تھا۔ آواز میں رس تھا روحوں میں پاکیزگی اور سچائی تھی۔ اب تو مولا ناجی شراب کی وجہ سے آواز ایسی پھٹی ہے کہ ایسا لگتا ہے ڈنکر کی طرح بَیں بَیں کر رہی ہوں۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے چہرے پر لعنت برسنے لگی ہے۔ عمر سے پہلے ہی بوڑھی ہوگئی ہوں۔ کمر میں بارہ مہینے درد رہتا ہے اور بھی بہت سے روگ لگے ہوئے ہیں۔ کرنی ہی جو اس طرح کی تھی۔ پھر شراب نے تو ایسی آگ لگائی کہ اندر کا سارا وجود ہی جل گیا۔ روح تک پھُنک گئی۔ پر اپنے بس میں کیا تھا۔ ساری زندگی دوسروں کی ٹھوکروں میں گزری۔ جس نے جہاں چاہا پھینک دیا۔ گھر سے نکلی کھلونا ہی بن گئی۔"

"ہم سب کھلونے ہیں" شرفو میاں نے اپنے بارے میں سوچا۔

میاں صاحب جوانی کا طوفان آزادی میں سب کچھ تنکے کی طرح بہالے جاتا ہے۔ سو میں بھی جوانی کے مُنہ زور طوفان میں بہہ گئی۔ پاس کے گاؤں میں دتّا رہتا تھا۔ کہتا تھا بڑی حسین ہوں۔ میری آواز میں جادو ہے۔ شہر میں فلموں میں کام کرنے کے ہزاروں روپے ملیں گے۔ بڑی عزت ہوگی۔ دِتا خود بھی سجیلا تھا۔ بانسری تو غضب کی بجاتا تھا میں دِتا کے کہنے میں آگئی اور اپنے چھوٹے سے گھر اور بھائی بہنوں کو چھوڑ کر دِتا کے ساتھ اُس کے پیار میں اندھی ہو کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ دتّا مجھے شہر لے آیا اور کھیل شروع ہوگیا۔ بابا کی سفیدی میں میں نے بڑی بے رحمی سے کالک پوت دی۔"

فلم لائن اور دِتا، فلم لائن اور کیقباد، بانسری اور ماؤتھ آرگن۔ شرفو میاں

کو ایسا لگا جیسے وہ ریشماں کی نہیں ساجدہ کی کہانی سن رہے ہوں۔

ریشماں بولی

"دِتّا کا پیار طوفان تھا۔ تین مہینے تک دِتّا رات دن میرے کوٹھے سے لگا کھولی میں گھسا رہا۔ جیسے دن رات آتے ہی نہ تھے۔ دِتّا تھا اور میں تھی اور ایک جنون تھا لیکن جب گھر سے لائے ہوئے پیسے اور زیور ختم ہو گئے تو دِتّا سرد پڑ گیا۔ امڈا ہوا دھارا اُتر گیا طغیانی ختم ہو گئی۔"

ریشماں کی آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

"اور مولانا جی جب میں نے اُسے بتایا کہ میں اُس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں تو دِتّا ایکدم سنجیدہ ہو گیا۔ فلموں کے خواب ٹوٹ کر بکھر گئے کھولی میں اب اندھیرے اور اُجالے رینگنے لگے اور راتیں تو کاٹے نہ کٹتیں۔ دِتّا حرامی جو مجھے حسین کہتا تھا میرے گوشت پوست کے بدن کو چاندی کی مورتی بتاتا تھا۔ میری ہنسی کو قاتل اور چال کو جان لیوا کہا کرتا تھا میری ہر بات میں کیڑے نکالنے لگا۔ مجھے پھوہڑ اور گنوار کہنے لگا اور میرے پیٹ کا کیڑا تیزی سے بڑھنے لگا۔"

کھولی کے باہر کتے رونے لگے۔ راستہ ویران تھا اور تیز سنسناتی ہوئی ہوائیں چل رہی تھیں۔

ریشماں نے کہا

"ایسی رات کسی کی زندگی میں کبھی نہ آئے۔ وہ بڑی طویل، طوطا چشم، کٹھور، کٹھن اور بھیانک رات تھی۔ لاش کی طرح سرد اور خون کی طرح منجمد رات۔ اُس ایک رات میں صدیوں کا دُکھ کھل گیا تھا۔ جب وہ رات یاد آتی ہے میں ڈر جاتی ہوں۔ وہ رات میرے دھیان سے اُترتی ہی نہیں۔ اُس رات دِتّا اور اُس کے دوستوں نے مجھ سے میرا ننھا سا بچہ چھین لیا تھا۔ جو چند لمحے پہلے چیختا اور احتجاج کرتا ہوا اس دنیا میں آیا تھا۔ چند لمحوں بعد خاموش بے حس چیتھڑوں میں لپٹا ہوا میری نظروں کے سامنے سے چلا گیا۔ دِتّا کے دوست نہ جانے اُسے کہاں ڈال آئے، پھر میں نے اُسے دوبارہ نہیں دیکھا۔ لیکن دِتّا حرامی

مصلحتیں لئے بیٹھا تھا۔ وہ رات لاش کی طرح سرد اور ڈراؤنی تھی۔ اُس رات کے بعد چاندنی نہیں آئی، بہار نہیں آئی اور رینگھٹ کے گیت میرے سینے میں چبھنے لگے۔"

ٹک سونے دی کل ماہیا

مجھے آج بھی ایسا لگتا ہے جیسے چھوٹے چھوٹے ننھے ہاتھ میرے بہتے ہوئے آنسوؤں کو چھونا چاہتے ہیں مگر کوئی اَن جانی قوت اُن ننھے مُنے ہاتھوں کو پرے ڈھکیل دیتی ہے۔
اُس کے بعد میاں صاحب مجھے دِتّا نے اپنے دوستوں کے حوالے کر دیا۔ اُن دوستوں نے اپنے دوستوں کے سپرد کر دیا۔ میری راتیں میرے دن منڈی میں بکنے لگے۔ پھر نہ رات اپنی رہی نہ دن۔ پیارے پیارے مہکتے کومل گیت گندگی میں سَن گئے۔ رات شروع ہوتی تو بن سنور کر ٹھسے سے کاروبار کرتی آخری گاہک جاتا تو ویسے ہی نیم برہنہ سو جاتی۔ پھر دوپہر میں اُٹھتی تو ایسا لگتا جیسے نیند میں چل رہی ہوں۔ سورج کی روشنی آنکھوں میں چُبھتی ہوئی محسوس ہوتی۔ منہ بدمزہ رہتا اور پنڈلیاں اینٹھتی رہتیں۔"
شرفو میاں کو ایسا لگا جیسے اُن کے سامنے بہت سے نوزائیدہ بچے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے سسک رہے ہیں اور ریشمائیں اور ساجدائیں حرامی بچے جَن کر خاک و خون میں لتھڑی ہوئی درد سے کراہتی ہوئی برہنہ پڑی ہوئی ہیں۔
"مولانا جی۔ مٹی دیاں مورتاں ــــ" ریشماں کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔
"سچ ہے۔ ہم سب کھلونے ہیں۔ اَن گنت کھلونے جانے کس کس طرح مصلحت کے دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیئے جاتے ہیں۔ خون آلود بھینٹ۔ بے جان۔ بے حس۔ تنہا۔ اُداس۔ مردہ۔ تم بھی مر چکی ہو۔ میں بھی مردہ ہوں۔ روشنی کے سارے مینار ڈھا دیئے گئے ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں ریشمائیں، ان کھولیوں میں ہی نہیں، اُن بنگلوں میں بھی ہیں۔"
شرفو میاں نے ٹیلیفون ایکسچینج کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔
"پر مولانا جی ـ لوگوں کو چڑیوں کرٹیوں پر رحم نہیں آتا" ریشماں نے پوچھا۔
ریشماں کی کھولی سے نکل کر شرفو میاں، افسروں کے بنگلوں کے گرد کھنچی ہوئی تاروں کی باڑھ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے لکڑی کے وارنش کیے ہوئے گیٹ میں

داخل ہو گئے۔ ساگوان کی لکڑی اور وارنش کی بو غائب ہو چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے زینے پر چڑھ کر چھت پر آ گئے۔ ذہن میں ریشماں کی کہانی کا ایک ایک لفظ گونج رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنا چاہتے تھے کوئی فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ ساجدہ کی یاد نشتر کی طرح سینے میں چبھی ہوئی تھی۔

"کیقباد — ماؤتھ آرگن تو غضب کا بجاتا ہے۔ کہتا ہے فلموں میں ہیرو بنوں گا۔"

"دِتّا — مست کر دینے والی بانسری بجاتا ہے۔"

"ساجدہ — کیقباد — ریشماں — دِتّا — بانسری — ماؤتھ آرگن۔"

میری ساجدہ بھی اپنی زندگی سے راتوں کا شمار خارج کر دے گی۔ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر چوکھٹ سے لگی کیقباد حرامی کو گالیاں دیا کرے گی۔

"ساجدہ — ساجدہ — میری بچی" شرفو میاں زور سے چیخے۔ اُن کی آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی فضا میں دیر تک گونجتی رہی۔ آس پاس کے بنگلوں کی کھڑکیاں کھلیں اور بتیاں جل گئیں۔ لیکن جب دوبارہ کوئی آواز نہ سنائی دی تو ایک ایک کر کے ساری کھڑکیاں بند ہو گئیں۔

ریشماں اپنی کھولی سے لمحہ بھر کے لئے باہر آ گئی۔

شرفو میاں زیرِ لب بڑبڑائے۔

"تم پرانے سماج سے بیزار ہو۔ پرانے رشتوں سے کٹ گئے ہو نیا سماج اور نئے رشتے تمہیں اپنا نہیں سکے۔ ہم سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں اسی لئے میں اپنے آپ کو مٹی کا کھلونا سمجھ رہا ہوں۔ ریشماں بھی ایک ٹوٹا پھوٹا کھلونا ہے اور ساجدہ بھی۔ میرا ساجد بھی کھلونا ہے۔ اور بہو بھی۔ ہم کب تک اپنے گناہوں کو چیتھڑوں میں لپیٹ کر گلیوں میں ڈالتے رہیں گے۔ یہ خاک و خون میں لتھڑے ہوئے کھلونے ہماری بزدلی کا انجام ہیں میں آج بغاوت کر رہا ہوں۔ میں بھی اور ریشماں بھی" شرفو میاں نے تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کو دیکھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں اُن کی آنکھیں مستقبل کے اندھیروں کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر ان

کی نظریں سامنے کھولیوں کی طرف لوٹ آئیں۔ ساری کھولیاں تاریک تھیں، صرف ریشماں کی کھولی میں روشنی کی لکیر اب بھی نظر آرہی تھی۔ یہ روشنی کی واحد لکیر تھی ــ کمزور کانپتی ہوئی ــ روشنی کی واحد لکیر۔

آخری دسمبر کی ایک صبح شرفو میاں گھر سے لاپتہ ہو گئے۔ ساجد نے تلاش کیا۔ انتظار کیا اور پھر چپ ہو گیا۔ شرفو میاں کو پھر کسی نے نہیں دیکھا۔ ساجد کے دوستوں کی تعداد زیادہ بڑھ گئی تھی۔

شرفو میاں غائب ہو گئے ــ ریشماں کہیں چلی گئی۔

ساجدہ کا کمرہ خالی تھا اور ریشماں کی کھولی تاریک۔!

○

دیواریں

پیرجی صبح ہی بستی سے گردن جھکائے چل دیے۔ نیا سماج گلی کے ہر موڑ پر اُن کا منہ چڑا رہا تھا۔ اور بستی کے لوگ حسب معمول مزے سے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ سب کچھ پرسکون تھا۔

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب میں سرکنڈوں کی دیواروں اور چٹائیوں کی چھت والی جھونپڑی میں رہا کرتا تھا۔ یہ غیر قانونی جھونپڑیاں علاقے کے بدمعاشوں، سیاسی کارکنوں اور سپاہیوں کی مشترکہ کوششوں سے وجود میں آئی تھیں۔ نام نہاد سیاسی کارکن پلاٹ تجویز کرتے، بدمعاش پلاٹ کی قیمت وصول کرتے اور سپاہی چشم پوشی کا معاوضہ ہفتوں وصول کرتے رہتے اور جب جھونپڑی پُرانی ہو جاتی تو ملکیت تسلیم کر لی جاتی۔ جب کبھی کوئی سر پھرا زمین خدا کی سمجھ کر بغیر بدمعاشوں کو معاوضہ دیے جھونپڑی بنانے کی کوشش کرتا تو مکے بازی ہوتی، اکھاڑ پچھاڑ ہوتی اور کبھی کبھی چاقو چھریاں چل جاتیں تو پولیس کو دخل دینا پڑتا اور علاقے کے بدمعاش کے مشوروں پر پولیس والے

اُس باڑے کو سمجھاتے کہ زمین خدا کی نہیں سرکاری ہے۔ یہ جھونپڑیاں شہر سے باہر بنائی گئی تھیں جہاں سے خودرو جھاڑیوں اور کیکر کے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا آس پاس کا میدان جھونپڑی میں رہنے والوں کی غلاظت سے اَٹا ہوا تھا۔ صبح صبح اِس بستی کے مرد اور عورتیں جھونپڑیوں سے نکل کر دو سمتوں میں تقسیم ہو جاتے۔ ایک طرف عورتیں چلی جاتیں اور دوسری طرف مرد اور اپنے اپنے علاقے کی اس تقسیم پر مرد اور عورتیں دونوں ہمیشہ پابندی سے عمل کرتے۔ ساری جھونپڑیاں چٹائیوں اور سرکنڈوں سے بنائی گئی تھیں اور ایک دوسرے کی دیوار سے دیوار ملانے کا سلسلہ تقریباً پانچ ہزار جھونپڑیوں تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ دیواریں احساس کے طور پر تھیں ورنہ اِن کے اطراف ہونے والی گفتگو اور حرکات میں اردگرد کی جھونپڑیوں کے تمام لوگ ذہنی طور پر برابر کے شریک ہوتے۔

میں جس جھونپڑی میں رہتا تھا وہ ایک پتلی سی گلی کے موڑ پر واقع تھی جہاں ایک اور پتلی سی گلی آکر مل گئی تھی اور یہاں ایک چھوٹا سا چوراہا بن گیا تھا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو قطع کرنے والی گلیاں شروع شروع میں اتنی چوڑی تھیں کہ میونسپل کارپوریشن کا پانی سپلائی کرنے والا بھاری بھرکم ٹرک ہفتہ میں ایک دو بار اِن میں سے گذر جایا کرتا تھا لیکن جھونپڑیاں بڑھانے کی ہوس میں یہ گلیاں اتنی سمٹتی گئیں کہ اب ان میں کسی سواری کا داخل ہونا ناممکن تھا۔ چنانچہ اب جھونپڑی کے رہنے والے مین روڈ پر میونسپلٹی کے اکلوتے نل پر بالٹیوں اور گھڑوں کی قطاریں لگا کر ایک دوسرے کو گالیاں دیا کرتے یا پھر پاکستان کی شہری سہولتوں کے فقدان پر تنقید کرتے ہوئے اپنے چھوڑے ہوئے شہروں سے موازنہ کرتے۔ میونسپل کارپوریشن کا پانی سپلائی کرنے والا ٹرک اب کیوں نہیں آتا اس موضوع پر سب دم سادھ لیتے اور لمبی لمبی زبانیں اس طرح سکڑ کر منہ کے خول میں بند ہو جاتیں جیسے انہیں بولنا ہی نہ آتا ہو۔ اس چھوٹے سے چوراہے کے ایک کونے پر ایک چائے خانہ تھا جہاں سے ہر وقت جلے ہوئے دودھ اور کوئلوں کی بو آتی رہتی اور رات گئے تک لوگ لکڑی کی بنچوں پر بیٹھے سیاست، فلم اور ہوٹل کے اندر سرکنڈوں کی دیواروں

پر لگی ہوئی فلمی اداکاراؤں کی تصویروں کے حسن اور شباب پر گفتگو کرتے رہتے۔ اس چائے خانے کی افادیت اس وقت بڑھ جاتی جب کوئی مہمان آجاتا اور جھونپڑی کی حالت اُس مہمان کی متحمل نہ ہو سکتی تو اُسے باہر ہی باہر تواضع کر کے رخصت کر دینے میں جو سکون ملتا تھا اس کا اندازہ مشکل ہے۔ دوسرے کونے پر مشرقی پنجاب سے آیا ہوا ایک خاندان آباد تھا۔ اس جھونپڑی میں اتنے بڑے خاندان کا گذارہ بمشکل ہوتا تھا۔ دن میں جب مرد چلے جاتے تو اتنا زیادہ محسوس نہ ہوتا لیکن رات کو جگہ تنگ ہو جاتی۔ ہمیشہ جب گلی کی جانب کی سرکنڈوں کی دیوار ٹیڑھی ہوتی تو رات میں اسے دوبارہ سیدھا کیا جاتا اور دو چار انچ دیوار گلی کی طرف کھسک آتی اور مجھے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ ایک روز اچانک اس جھونپڑی کی متحرک دیوار میری جھونپڑی کی نیم جان دیوار سے مل جائے گی اور گلی اچانک غائب ہو جائے گی۔ اس خاندان کے مرد بڑے کم گو اور خاموش طبیعت تھے اور انہیں بستی کے بہت کم لوگ جانتے تھے لیکن اس واحد عورت کو سب ہی جانتے تھے جو ہر سال کچھ دنوں کے لئے جھونپڑی میں روپوش ہو جاتی اور جب نمودار ہوتی تو اس کی گود میں ایک گلگوتھنا سا بچہ ریں ریں کرتا رہتا اور وہ جھونپڑی کی دیوار کے سہارے گلی کے موڑ پر بیٹھی ہوئی اُسے تیل ملا کرتی۔ وہ جب اُمید سے ہوتی جب بھی اسی دیوار کے سہارے گلی کے موڑ پر بیٹھی ڈھیلے پائنچوں والی شلوار گھٹنوں کے اوپر تک چڑھائے کھجا کھجا کر ران پر لکیریں بناتی رہتی اور پرچون کی دکان سے ملتانی کی ٹکیاں لے کر چباتی رہتی اور بیزاری سے ہر گذرنے والے کو تنقیدی نظروں سے دیکھتی رہتی۔ اگر کسی پڑوسی سے ٹھن جاتی تو خواہ مرد ہو یا عورت اُس کے بخئے اُدھیڑ دیتی اور ایسی گالیاں فراٹے سے دیتی جن میں ماں، بہن اور بیٹی کا تذکرہ بانس کے ساتھ ضرور آتا اور ہر ایک کا کسی نہ کسی سے ناجائز تعلق ضرور تلاش کر لیتی۔ اس عورت سے ٹکر لینے کی کسی میں ہمت نہ تھی لیکن اس سے لڑائی ہونے کی صورت میں یہ ضرور معلوم ہو جاتا تھا کہ محلے کی کس عورت کا کس مرد سے ناجائز تعلق ہے اور محلے کی شاید ہی کوئی عورت ہو جس کا کم از کم ایک مرد سے ناجائز تعلق نہ ہو یا کم از کم ہر لڑائی کے دوران وہ اسی طرح کے اعلانات کرتی رہتی۔ اُس کے یہاں کبھی کبھی ایک سانولی سی

طرحدار عورت تین چار سال کا بچہ لئے ہوئے آیا کرتی تھی۔ جو قریب ہی کسی جھونپڑی میں رہتی تھی اور ہمیشہ سرخی پاوڈر سے لیس رہتی۔ اُس کی بستی کے ہر نوجوان سے بے تکلفی تھی اور اُسے ہر شخص پر فقرہ چست کرنے کی عادت تھی لیکن آپس کی لڑائی کے دوران بھی اُس کے بارے میں کسی طرح کی بات کبھی نہ سنائی دیتی۔ شاید اُس کا ماضی صاف تھا یا کم از کم اُس کے بارے میں اس منہ زور عورت کو کوئی علم نہ تھا۔

اس چوراہے کے تیسرے کونے پر ایک پرچون کی دوکان تھی جہاں سے ملتانی کی ٹکیوں سے لے کر راشن تک خریدا جا سکتا تھا۔

اِس دوکان کا مالک ایک سنجیدہ اور باریش خوبصورت نوجوان تھا۔ جو لین دین کا کھرا اور صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا۔ لیکن کچھ نوجوان اُسے اس لئے بُرا بھلا کہتے تھے کہ وہ جماعت اسلامی سے متاثر تھا اور اُسے مُلّا کہہ کر تو سب ہی مخاطب کرتے تھے۔

میری جھونپڑی سے ملحق ایک ٹیلر ماسٹر اپنی بیوی کے ساتھ رہا کرتا تھا جو تقریباً روز ہی شام کو کام سے واپس آکر اپنی بیوی کو پیٹتا تھا۔ پہلے وہ انتہائی لجاجت سے شوہر کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی لیکن ٹیلر ماسٹر سور کی بچّی سے شروع کرتا اور طمانچوں اور گھونسوں پر تان ٹوٹتی اور تقریباً ساری رات ہی مغلظات کا سلسلہ جاری رہتا۔ رات کے پچھلے پہر دونوں میں سرگوشیاں شروع ہوتیں اور دبے دبے قہقہے اُبھرنے لگتے اور نئی صبح ٹیلر ماسٹر خوش وخرم کام پر جانے لگتا تو بیوی اُسے فرمائشوں سے لاد دیتی۔ جب تک ماسٹر نے اپنی لڑکی کی شادی نہ کی تھی بیٹی ماں باپ کے درمیان جلدی صلح صفائی کرا دیتی اور جلد ہی سرگوشیاں اور قہقہوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ لیکن شادی کے بعد نہ صرف بیوی پر اُس کا غصّہ شدید ہو گیا تھا بلکہ بیٹی اور داماد کی بھی ماں بہنیں تولنے لگا تھا۔ ماسٹر کو شبہ تھا کہ اُس کی بیوی اُس کی عدم موجودگی میں ضرور کسی سے آنکھیں لڑاتی ہے حالانکہ اُس کا شبہ بہت پرانا تھا مگر ماسٹر صرف اُس کا تذکرہ ہی کر کے رہ جاتا تھا۔ ٹیلر ماسٹر کی بیوی ساری رات پٹنے کے باوجود ماسٹر کے جانے کے بعد پڑوسنوں سے اس طرح لہک لہک کر باتیں کرتی جیسے رات بڑے سکون سے گذری ہو۔ پڑوسنوں سے

گفتگو کرنے کے لئے کسی طرح کے اہتمام یا کام میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہ تھی جو جہاں ہوتی وہیں سے جس پڑوسن کو چاہتی۔ آواز دیتی اور بلائی جانے والی جہاں جو بھی کام کر رہی ہوتی وہیں سے جواب دیتی اور سلسلہ کلام شروع ہو جاتا اور اگر کسی تیسری پڑوسن کو ضرورت محسوس ہوتی وہ بھی وہیں سے گفتگو میں شریک ہو جاتی۔ کوئی بھی پڑوسی مرد ان عورتوں کو دیکھ کر نہ پہچان سکتا تھا لیکن اگر ان کی آواز سن لے تو بلاشبہ پہچان لیتا تھا۔ اس جھونپڑی کے رہنے والے ایک دوسرے کو شکلوں سے نہیں آوازوں سے پہچان سکتے تھے۔

سامنے کی طرف اُس منہ زور عورت کے برابر والی جھونپڑی میں ایک بوڑھی عورت اپنے دو جوان پوتوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کا تعلق راجھستان کے کسی قصبہ سے تھا۔ اُس کے پوتوں میں سے ایک کسی مل میں ملازم تھا اور دوسرا کسی کی گدھا گاڑی چلایا کرتا تھا اور اکثر رات میں سوتے سوتے "کھخ۔ کھخ۔ کھخ اور" ہی ٹے" کی آوازیں نکالتا رہتا تھا۔ رات میں دونوں بھائی فلموں کا تذکرہ کرتے۔ اپنی اپنی دیکھی ہوئی فلموں کی کہانیاں مع مکالموں کے سناتے اُن فلموں کے گانے کن سُری آوازوں میں گاتے جاتے اور یہ سلسلہ گئی رات تک چلتا رہتا۔ کبھی کبھی پڑوس کے شائقین فرمائشوں کا سلسلہ شروع کر دیتے اور سونا ناممکن ہو جاتا۔

ساری بستی نچلے طبقے کے افراد پر مشتمل تھی۔ اور ہر طرف سے بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتیں انہیں اپنی پستی اور بدحالی کا قطعی کوئی احساس نہ تھا۔ یہ دن بھر اپنے کام پر رہتے۔ شام کو پھوس کے چائے خانوں میں کسیلی اور اونٹی ہوئی چائے پیتے اور اس جائیداد کا رونا ضرور روتے جو وہ چھوڑ آئے تھے اور گویا یہ اُن کا بہت بڑا احسان تھا جو وہ اس طرح رہ رہے تھے۔ یا پھر فلمیں دیکھتے، بیویوں کو پیٹتے، کبوتر اُڑاتے اور ٹاٹ کی پلیوں پر تاش کھیلتے۔ بستی پر ہر وقت ایک غم آلودسی دھند چھائی رہتی جس میں چائے خانوں کا دھواں اضافہ کرتا رہتا۔ اور سڑے ہوئے کیچڑ کی بو ہر طرف پھیلی رہتی۔

ایک شام جب میں دفتر سے فارغ ہو کر حسب معمول صدر کے چائے خانوں میں

باری باری بیٹھ کر لوگوں سے ملاقاتیں کرتا ہوا کوئی نو بجے رات کو گھر واپس پہنچا۔ (کیونکہ اس سے قبل واپسی بسوں میں رش کی وجہ سے کسی طرح بھی ممکن نہ تھی) تو معلوم ہوا کہ میرے برابر والی جھونپڑی میں پیر جی آ گئے تھے اس طرح اب میری جھونپڑی ٹیلر ماسٹر اور پیر جی کی جھونپڑی کے بیچ میں تھی۔ پیر جی سے پہلے اس جھونپڑی میں ایک خاموش سی بیوہ رہا کرتی تھی جو کسی مل میں کام کر کے اپنا اور تین بیٹیوں کا پیٹ پالا کرتی تھی، پیر جی کی آمد نہ جانے کیوں مجھے سنسنی خیز سی لگی۔ غالباً اس وجہ سے کہ پیر جی سے منسوب ہمیشہ سنسنی خیز خبریں سننے میں یا پڑھنے میں آیا کرتی تھیں کبھی روپیہ دوگنا کرنے کے بہانے ہزاروں روپے لے کر، کبھی کسی کی لڑکی کو لے کر، کبھی کسی کی بیوی اور زیورات لے کر فرار ہو نے ہی سنا یا پڑھا تھا۔

"اب کچھ ہو گا" میں نے اپنے آپ سے کہا۔

لیکن جب میں نے نئے سرکنڈوں اور چٹائیوں کی چمک دیواروں اور چھتوں میں دیکھی جو پیر جی نے اپنی جھونپڑی مضبوط کرنے کے لئے لگائی تھی تو میرا شبہ جاتا رہا۔ یہ پیر جی فرار ہونے والے نہیں تھے یہ یہاں رہنے ہی کے لئے آئے تھے کیونکہ پیر جی نے اپنی جھونپڑی کی دیواریں اونچی اور مضبوط بنائی تھیں۔ اونچی اور مضبوط دیواریں جو تحفظ کا احساس دلاتی ہیں اور اعتماد بحال کرتی ہیں چاہے وہ سرکنڈوں ہی سے بنائی گئی ہوں۔

جب میں نے لیمپ روشن کیا تو میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا یہ پیر جی تھے میرے بلانے پر میرے ساتھ جھونپڑی میں آ گئے۔ پیر جی کی عمر کوئی پچپن ساٹھ کے لگ بھگ ہو گی۔ دُہرا جسم بھرے بھرے چہرے پر سفید بُرّاق سی لانبی داڑھی چوڑی پیشانی پر سجدے کا نمایاں نشان، چہرے پر تقدس کا نور، اور اُس پر سفید کرتا۔ سفید شلوار اور تنکوں والی ٹوپی اور گلے میں پیلے رنگ کا ریشمی رومال۔ وہ مجموعی طور پر بڑے بارعب نظر آ رہے تھے۔

"میں آج ہی آپ کے پڑوس میں آیا ہوں۔ سوچا آج ہی آپ سے مل لوں،"

پیر جی بولے۔

"جی"

"آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے بے وقت آپ کو زحمت دی"۔

"جی۔ جی نہیں۔ آپ تشریف رکھیں نا" میں نے اکلوتی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

پیر جی کرسی پر بیٹھ گئے اور میں ٹین کے بکس پر کہ ہمیشہ اسی طرح ہوتا تھا۔ البتہ اگر ایک سے زیادہ ملنے والا ہو تو پھر باہر چائے خانے میں بہتر تواضع ہو سکتی تھی۔ پیر جی نے میرا انٹرویو لے لیا تو بولے۔

"میاں اب یہاں پڑوسی ہی سب کچھ ہیں۔ مرنا جینا سب ساتھ ہی ساتھ ہے۔ ایک تو عزیز بچھڑ گئے اُن کا غم۔ جو یہاں ملے انہوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ اگر عزیز بچھڑ جائے تو دکھ ہوتا ہے لیکن آنکھیں پھیرے تو پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ بس اب تو اگر قسمت سے اچھے پڑوسی مل جائیں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے"۔

"میں تو واقعی خدا کا شکر گذار ہوں"۔

پیر جی ہنس دیئے۔

پیر جی نے بتایا کہ وہ اسی ہفتے ہندوستان سے آئے ہیں۔ وہاں سجادہ نشین تھے چھوٹی سی جائیداد تھی اُن کا خیال تھا کہ ترکِ سکونت غیر ضروری ہے۔ اُنہیں وہیں رہنا چاہیئے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے جہاں اُن کے بزرگوں نے روایتیں قائم کی تھیں۔ جہاں اُن کی جڑیں گہری اور مضبوط تھیں مگر فسادات کی وجہ سے انہیں بھی ترکِ سکونت قبول کرنی پڑی اور وہ پاکستان آنے پر مجبور ہو گئے۔ اُن کی اکلوتی بیٹی بھی اُن کے ساتھ تھی اور اس جھونپڑی میں رہنا اپنی بیٹی کی وجہ سے نامناسب سمجھتے تھے۔ اس ماحول میں اُن کی بیٹی جس نے کبھی کسی غیر محرم کی صورت بھی نہ دیکھی تھی کس طرح رہ سکے گی۔ یہ فکر اُن کو کھائے جا رہی تھی۔

"ہم مسلمان بڑے جذباتی ہیں" پیر جی بولے "ہمیں آسانی سے جذباتی نعروں کے ذریعہ گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ غالباً ہم پاکستان کے مالک بننے کے اہل نہیں تھے۔ ہم

نے اپنی شیرازہ بندی بھی نہیں کی تھی۔ اپنے آپ کو ہم نے ابھی اس قابل نہیں بنایا تھا کہ اُس نظام کو رائج کر سکیں جس کے نام پر ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ میں سیاسی مفکر نہیں ہوں مگر میرا خیال ہے ہمارے قائدین بھی مستقبل کے لئے پورے اخلاص سے وعدہ نہیں کر رہے تھے اُن کے پاس جس نظام کے لئے تربیت یافتہ لوگ نہیں تھے وہ نظام وہ کس طرح رائج کر سکتے تھے مگر چند ......"

پیر جی تھوڑی دیر خاموش بیٹھے لیمپ کی کانپتی ہوئی لو دیکھتے رہے۔

"اگر تیز ہوا کا جھونکا آ گیا تو لیمپ گل ہونے کا خطرہ ہے" ——— اچھا خدا حافظ"

پیر جی کے جانے کے بعد میرا اعتماد بحال ہو گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ اُن پیروں میں سے نہیں ہیں جو فرار ہو جاتے ہیں، اُن کی بیٹی ان کے ساتھ ہے۔ انہوں نے جھونپڑی کی دیواریں بلند کی ہیں اور نئی چٹائیوں سے اِن دیواروں کو مضبوط بنایا ہے۔ غالباً نظریاتی طور پہ کانگرسی ہیں یا پھر اُن کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے نہیں ہے جو کچھ انہوں نے جس طرح محسوس کیا ہے اُسی طرح کہہ دیا ہے۔

پھر مجھے پیر جی کی اُس بیٹی کا خیال آیا جس نے کسی نامحرم کی شکل تک نہ دیکھی تھی اور یہاں گلی کے موڑ پر حاملہ عورت ننگی ران کھجایا کرتی ہے ٹیلر ماسٹر اپنی بیوی کو رات بھر مغلظات سناتا ہے۔ لڑائیوں میں عورتیں ایک دوسرے کے ناجائز تعلقات گناتی ہیں، عریاں فلمی گیت گائے جاتے ہیں۔ پیر جی کی بیٹی کس کس محاذ پر مقابلہ کرے گی۔

امتحانات کی تیاری کے سلسلے میں کئی دنوں مسلسل بستی سے باہر رہنے کے بعد جب میں بستی میں داخل ہوا تو شام کا وقت تھا۔ جھکے ہوئے چھجے والے چائے خانے میں پیر جی کے ارد گرد بستی کے بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرح کا درس جاری تھا۔ پیر جی لوگوں کو نیک بننے اور نیکی پھیلانے کی تلقین کر رہے تھے اور لوگ پیر جی کے گرد ہمہ تن گوش بیٹھے ہوئے تھے۔

"ہمارا کام صرف یہ نہیں ہے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ لیں۔ صبح صبح قرآن کی تلاوت کر لیں۔ اور یہ سمجھ لیں کہ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں اسلام نافذ کرنا ہے۔ قرآن اس لئے ہے کہ ہم اس سے نظامِ مملکت سے لے کر روزمرہ کی نشست و برخاست میں ہدایت حاصل کریں۔ یہ تعویذ اور گنڈوں کے لئے نہیں پڑھنے اور سمجھنے کے لئے ہے۔ یہ ہمارا قانون ہے۔

تقریباً سب ہی پیر جی کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے مغرب کی اذان ہوتے ہی پیر جی بنچ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"چلو کہ مالکِ حقیقی کا بلاوا ہے"۔

سب لوگ پیر جی کے پیچھے پیچھے مسجد کی طرف چل دئے۔ ایک دو چپ چاپ دوسری طرف گلیوں میں مڑ گئے۔ پیر جی مجھے دیکھ کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"اتنے دنوں کہاں رہے"۔

"ذرا شہر میں رہ گیا تھا"۔

"یہاں تقریباً آس پاس کے سب ہی لوگوں سے ملاقات ہو گئی ہے۔ لوگ میری ٹوٹی پھوٹی باتیں توجہ سے سنتے ہیں۔ نمازیوں میں اضافہ ہوا ہے"۔

"یہ تو بڑی مبارک بات ہے"۔

"مجھے یقین ہے کہ ایک دن ضرور۔ اس سرزمین پر خدا کی حکمرانی ہو گی۔ یہ چھوٹے بُت ٹوٹ کر رہیں گے"۔

مسجد میں داخل ہوتے ہی پیر جی خاموش ہو گئے

دوسرے دن صبح سویرے پیر جی چند نوجوانوں کے ساتھ محلے کے لوگوں کو فجر کی نماز کے لئے دروازے دروازے جا کر جگا رہے تھے۔ میری بھی آنکھ کھل گئی۔ ہر چند کہ مجھے سحر خیزی کی عادت نہ تھی لیکن پیر جی کے خیال سے میں بھی شریک ہو گیا۔ فجر کی نماز کے بعد پیر جی نمازیوں کے ساتھ مسجد کے صحن میں بیٹھ کر درسِ قرآن میں مصروف ہو گئے کوئی آدھ گھنٹہ یہ سلسلہ جاری رہا پھر انہوں نے میرا تعارف دوسرے نمازیوں سے کرایا۔

مسجد سے نکل کر پیر جی میرے ساتھ ساتھ میری جھونپڑی میں آ گئے۔ جب ہم جھونپڑی میں داخل ہوئے تو پیر جی کی بیٹی تلاوتِ کلامِ پاک میں مشغول تھی۔ مجھے عجیب سا روحانی کیف محسوس ہوا۔ صبح کا وقت تھا۔ تازہ ہواؤں کے نرم جھونکے ہولے ہولے چل رہے تھے اور اِن جھونپڑیوں کے ماحول میں جہاں بازاری فلمی گانے اور گالیاں عام تھیں اور کان انہیں آوازوں سے اب تک آشنا تھے پیر جی کی بیٹی کے مقدس ترنم نے فضا میں وجدانی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔

"میری بیٹی عابدہ ہے"۔ پیر جی میری خاموشی کو طویل ہوتا دیکھ کر بولے۔

"میں تنہا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جو کچھ ہو سکتا ہے کر رہا ہوں لیکن غربت، جہالت اور بے حسی نے میرا کام بے انتہا مشکل بنا دیا ہے۔ شریف بھی میرے ساتھ صبح لوگوں کو نماز کے لئے جگاتا ہے۔ اُس نے فلمی گانا بند کر دیا ہے"۔

"شریف کون"

"سامنے کی جھونپڑی میں رہتا ہے۔ ہر رات بارہ بجے تک فلمی گانے گایا کرتا تھا"۔

"میں سمجھ گیا"۔

"دراصل میں مطمئن نہیں ہوں۔ میرے لحاظ سے یا کہنے سننے سے نماز میں شریک ہو جانا یا فلمی گانوں سے پرہیز کر لینا کافی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں احساس ہو کہ اُن پر خدا کی طرف سے بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اِن جھونپڑیوں میں چرس کی دوکانیں ہیں۔ جوئے کے اڈے ہیں۔ شراب فروخت ہوتی ہے لیکن ایک ایسی جگہ نہیں ہے جہاں لائبریری قائم ہو سکے۔ جہاں لوگ بیٹھ کر مطالعہ کریں۔ یہ لوگ میرے خیال سے نماز پڑھتے ہیں انہیں خدا کا خوف ہونا چاہیئے"۔

"میرا خیال ہے سر دست اتنا ہی بہت ہے۔ انشاء اللہ آپ یقیناً کامیاب ہوں گے"۔ میں نے کہا۔

"حیرت کی بات یہ ہے کہ چرس فروشوں کو پولیس کچھ نہیں کہتی۔ جوئے کے اڈوں سے کسی کو نہیں پکڑا جاتا اور شراب فروشی کے کاروبار میں پولیس بھی شریک ہے۔

اور کوئی اِن سے یہ نہیں پوچھتا کہ پھر پولیس کے وجود کا کیا فائدہ ہے"۔

"پولیس میں رپورٹ تو کی جا سکتی ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ برائی کی قوتیں متحد ہیں اور نیکی منتشر ہے۔ نیکی کی قوتوں کو متحد اور منظم کرنے کی ضرورت ہے"۔

عابدہ کی تلاوت ختم ہو چکی تھی۔ پیر جی بھی جا چکے تھے۔ نہ معلوم کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پیر جی کی کوششوں اور لوگوں کے تعاون کے باوجود کہیں کچھ نہ کچھ کمی ہے اور یہ جوش و خروش عارضی ہے۔ شاید یہ ایک آدمی یا چند آدمیوں کی کوششوں سے زیادہ مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ برائیوں کی بیخ کنی کے لئے منظم کوشش کرے یہ بڑی عجیب بات محسوس ہو رہی تھی کہ مملکت کی نگرانی میں چرس اور شراب فروخت ہو رہی ہو جوئے کے اڈے چل رہے ہوں اور قحبہ خانے قائم ہوں اور ایک نحیف بوڑھا لوگوں کو مسجد کی طرف بلا رہا ہو۔ یہ ایک مضحکہ خیز مقابلہ تھا۔

عام طور سے یہ ہوتا کہ جب محلہ میں عورتیں لڑنا شروع کرتیں اور تفصیل سے گالیاں شروع ہوتیں تو پیر جی عابدہ سے اونچی آواز میں باتیں شروع کر دیتے یا بلند آواز سے کوئی مناجات شروع کر دیتے۔ اسی طرح جب کسی طرف کوئی عریاں فلمی گیت چھڑ جاتا تو پیر جی تلاوت شروع کر دیتے تاکہ اُن کی بیٹی عابدہ کے کانوں تک یہ آوازیں نہ پہنچ سکیں لیکن جھونپڑی کی نیچی دیواریں اور پیر جی کی بلند آواز سے پڑھی ہوئی مناجاتیں اِن آوازوں کو نہ روک سکتی تھیں۔ ایک طرف پیر جی تلاوت کر رہے ہوتے اور دوسری طرف کوئی گا رہا ہوتا۔

جادوگر سیاں۔

چھوڑو مری بہیاں۔

ہو گئی آدھی رات۔

اب گھر جانے دو۔

ایک شام پیر جی مجھے اور شریف کو لے کر بستی کا چکر لگانے کے لئے نکلے شریف

اب پابندی سے پیر جی کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔ پیر جی بھی شریف کی بے انتہا تعریف کرتے رہتے تھے۔ ہم ایک تنگ گلی سے گذر رہے تھے۔ گلی میں جگہ جگہ گندہ پانی جمع تھا۔ سامنے نل پہ پانی کے منتظر لوگ بالٹیوں اور گھڑوں کی قطاریں لگائے ہوئے کھڑے تھے۔ عورتیں بالٹیاں قطاروں میں لگاتے ہوئے ایک دوسرے کو فرفر گالیاں دیئے جا رہی تھیں۔ پاس ایک بہت خوبصورت بچّہ دوسرے بچّے سے لڑ رہا تھا اور ساتھ ہی اپنی توتلی زبان سے گالیاں دے رہا تھا۔

"سالے تیری ماں" — (ایک بھرپور گالی)

چھوٹا بچّہ جس کے منہ سے گالیوں کے تلفظ صحیح ادا نہیں ہو رہے تھے گالیاں بکتے ہوئے بڑا اجنبی سا لگ رہا تھا۔ پیر جی نے اُس بچّے کو گود میں اٹھا لیا۔ قریب ہی پرچون کی دوکان سے بسکٹ دلا کر دیر تک اُسے سمجھاتے رہے۔ بچّہ سہما ہوا اُن کی ہر بات پر اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ جب ہم جھونپڑی واپس پہنچے تو پیر جی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ اُس بچّے کی توتلی زبان سے نکلی ہوئی گالیاں اُسی انداز سے بار بار دہرا رہے تھے اور آنسوؤں سے اُن کا چہرہ تر ہوتا جا رہا تھا اُس دن پیر جی مجھے بہت عظیم لیکن بہت ہی دکھی انسان نظر آئے۔ وہ گھنٹوں سسکیاں لیتے رہے۔ پیر جی رو رہے تھے، مُلّا رو رہا تھا۔ انسان رو رہا تھا۔ یہ کب تک اپنی بے بسی پر روتا رہے گا میرے ذہن میں اسی طرح کے فضول سوالات کا تانتا بندھ گیا۔ حتّٰی کہ شریف پیر جی کے لئے پانی لے آیا اور پیر جی تھوڑی دیر بعد پھر نارمل نظر آنے لگے۔

پیر جی کسی کپڑے کی دوکان پر ملازمت کرنے لگے تھے میں اپنی مصروفیت کی وجہ سے زیادہ تر بستی سے باہر رہنے لگا تھا دو دو ہفتوں کے بعد چند لمحوں کے لئے بستی میں آتا تو پیر جی سے ملاقات بھی نہ ہو پاتی لیکن کسی نہ کسی سے پیر جی کے مشن کے بارے میں حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ اب وہ رات میں بچّوں کو مفت تعلیم بھی دینے لگے تھے اور لائبریری اور تعلیم بالغان کی جگہ کے لئے مناسب جھونپڑی خریدنے کے لئے چندہ بھی جمع کر رہے تھے لیکن شراب اور چرس بھی فروخت ہو رہی تھی۔ جوا خانہ بھی

جاری تھا۔ فلمی گانوں کی گونج بھی تھی اور گلی کے موڑ پر بیٹھی ہوئی عورت رانوں تک شلوار چڑھائے اب بھی بیٹھی گذرنے والوں کو بیزاری سے دیکھتے ہوئے کھجایا کرتی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا میں کئی ہفتوں کے بعد بستی آیا تھا اور جھونپڑی میں بیٹھا شیو کر رہا تھا۔ پیر جی کی جھونپڑی کی دیوار ٹیڑھی ہو چلی تھی اور سرکنڈوں پر سیاہی دوڑ گئی تھی۔ پیر جی غالباً ابھی دوکان سے واپس نہ آئے تھے۔ اچانک میرے کانوں میں پہلے ہولے ہولے گنگنانے کی آواز آئی پھر آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی۔ میرے ہاتھ میں ریزر لرز کر رہ گیا۔ سامنے رکھے ہوئے آئینے میں مجھے اپنی شکل اجنبی نظر آنے لگی۔ پیر جی کی جھونپڑی سے عابدہ کے گانے کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ عابدہ کی خوش الحان تلاوت میں ہمیشہ سنا کرتا تھا آج وہ فلمی گیت بڑی بے پرواہی سے گا رہی تھی۔

اب گھر جانے دو
ہو گئی آدھی رات
اب گھر جانے دو
پھیکا پھیکا کجرا
ٹوٹا ٹوٹا گجرا
کہہ دے گا ساری بات
اب گھر جانے دو

میرے ہاتھ میں ریزر لرزتا رہا۔ آئینے کا اجنبی چہرہ مجھے گھورتا رہا اور عابدہ گاتی رہی اُسے پورا فلمی گیت ازبر یاد تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے پیر جی کا چہرہ گھومنے لگا اور اُن کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔

"مجھے یقین ہے کہ ایک دن ضرور اس زمین پر خدا کی حکمرانی ہوگی۔"

"برائی کی قوتیں متحد ہیں اور نیکی منتشر۔"

"نیکی کی قوت کو متحد اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔"

میرا دماغ جھنجھنا کر رہ گیا۔ زہر پھیل چکا تھا۔ پیر جی جس دیانت داری مانند ہی

اور لگن سے بستی کے لوگوں کی بھلائی کے لئے کوشش کر رہے تھے اُس کا اثر مجھے کہیں محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن بستی کے ماحول کا زہر پیر جی کے خون میں سائرس کی طرح داخل ہو گیا تھا۔

بارش ہو جائے تو بستی والوں کی حالت انتہائی قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔ اُس رات بارش ہوئی تھی اور بستی کی ہر شے درہم برہم سی لگ رہی تھی۔ لوگ اپنا اپنا سامان سمیٹے بھیگے ہوئے چوہوں کی طرح جھونپڑیوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہر شے سے سڑاندسی اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی راستوں میں کیچڑ اور پانی کی وجہ سے جھونپڑی سے باہر نکلنا تقریباً ناممکن ہو رہا تھا۔ میں جب بستی لوٹا تو بارش بند ہو چکی تھی۔ جھکے ہوئے چھجوں والے چائے خانے بند تھے۔ جھونپڑیوں کے اندر جلنے والے لیمپ مدھم مدھم سے لگ رہے تھے میں اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا اپنی جھونپڑی میں داخل ہوا۔ جھونپڑی کے صحن میں پیر جی ٹہل رہے تھے۔ اندھیرا ہونے کے باوجود اُن کا سفید لانبا کرتا، سفید شلوار اور تنکوں والی ٹوپی اُن کو پہچاننے کے لئے کافی تھی۔ میں نے لیمپ روشن کیا اور روشنی میں پیر جی بھی صحن سے جھونپڑی کے اندر آ گئے۔ انہیں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پیر جی کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور داڑھی کے بال رسی کی طرح بٹے ہوئے تھے۔ چہرہ ستا ہوا تھا اور کاغذ کی طرح سفید تھا۔ اُن کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"تم نے سنا؟" پیر جی آہستہ سے بولے۔

"جی"

"تم نے کچھ سنا؟"

میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں اگر بولا تو کچھ ٹوٹ جائے گا۔

"تم نہیں جانتے۔ تم بھی نہیں جانتے۔" انہوں نے میرا بازو پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔

"میں لٹ گیا اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ میری پھولوں جیسی معصوم بچی کہیں چلی گئی۔"

میں سن سے ہو گیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" میرے منہ سے نکلا۔

"ہو بھی چکا۔ شریف سامنے والی بڑھیا کا پوتا۔ جس نے فلمی گانے الاپنا بند کر دیا تھا۔ جو ہر وقت ہر کام میں میرا ساتھ دیتا تھا۔ میری بیٹی عابدہ کو بھگا لے گیا ہے۔ سنتے ہو وہ چلی گئی۔ ساری بستی والے میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر آنکھیں مٹکاتے ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہیں۔ مجھ پر انگلیاں اُٹھاتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ اب کیا ہوگا۔ غالباً تم بھی میری مدد نہیں کر سکتے۔ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

پیر جی مجھے حیران چھوڑ کر میری جھونپڑی سے باہر نکل گئے اور اندھیروں میں گم ہو گئے۔

میں نے پیر جی کو پھر کبھی نہ دیکھا۔

○

"تم نے سمندر کی سطح کا سکوت ہی
دیکھا ہے۔ گہرائیوں تک تمہاری بھی
نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔ میں نے
غلط سمجھا دوسروں میں اور تم میں کوئی
فرق نہیں مجھے میری پہلی غلطی کی سزا
مل گئی۔ پہلا زخم جتنا گہرا ہے خلش
اتنی ہی لطیف ہے"

——— مگر ایک شاخِ نہالِ غم

مگر ایک شاخِ نہالِ غم

چاند کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے کاغذ کے گلدستے میں چنبیلی کا پھول مہک رہا ہو چنبیلی کی لچکتی ہوئی شاخ سے جسے ابھی ابھی توڑا گیا ہو۔

وہ سفید لیڈی ہملٹن کی شلوار اور سفید پاپلین کی بند گلے کی چست مکلّف فراک اس کے اوپر اونچا سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھی اور شیفون کا سفید دوپٹہ جوڑے کے میئر پن میں پھنسا ہوا نکھار رنگ میدے کی طرح سفید، بوٹا سا قد خوبصورت آنکھیں اور گداز جسم، جب وہ مسکراتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے طنز کر رہی ہو اور جب میں نے اسے جرم و سزا کے اس ماحول میں دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے چنبیلی کا تر و تازہ پھول کسی نے کاغذ کے نقلی پھولوں کے گلدستے میں لگا دیا ہو۔

میں نے سوچا تھا کہ میں چاند کے بارے میں کبھی کچھ نہ لکھوں گا اور لکھنے کے لئے میں نے اس میں ایسی کوئی بات محسوس بھی نہ کی تھی لیکن آج صرف ایک سال کے بعد جب میں ماضی کے سرمئی دھندلکوں میں جھانکتا ہوں تو پچھتاوے شدید ہو جاتے ہیں اور ایسا

محسوس ہوتا ہے جیسے بے شمار خواب بکھرے ہوئے ہیں جنہیں میں سوتے جاگتے دیکھتا رہتا ہوں اور اب جب بھی چاند میرے سامنے سے گذر جاتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے میرے قریب ہی کوئی ستارہ ٹوٹ کر گرا ہو۔

میری اور چاند کی پہلی ملاقات عدالت کے کمرے میں ہوئی۔ جہاں وہ کسی مقدمے کے سلسلے میں آئی تھی۔ اچانک میرے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر میز پر اپنی خوبصورت ڈائری رکھی اور سرخ بال پن میرے چہرے کے سامنے نچاتی ہوئی بولی۔

"ریلیز آرڈر پر دستخط ہو گئے؟"

میں بوکھلا گیا۔ ریلیز آرڈر پر دستخط ہونے یا نہ ہونے سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ مجھے اس کا علم تھا۔ اس کو اپنے اتنے قریب اور اتنا بے تکلف دیکھ کر سناٹے میں آ گیا چنبیلی کا پھول میرے بالکل قریب مہک رہا تھا۔

"میں نے ریلیز آرڈر کے بارے میں پوچھا تھا اور آپ اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے آپ کے پاس میرا وارنٹ آف اریسٹ ہو۔"

وہ اسی طرح میری ناک کے نیچے پنسل نچاتی ہوئی بولی مجھے اس کی بے تکلفی سے احساسِ کمتری ہونے لگا۔

"میں آپ کے ریلیز آرڈر کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"ذرا سا معلوم کر دیجئے نا۔"

میں نے بیشکار سے ریلیز آرڈر لے کر اُسے دے دیا۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور چلی گئی۔

کئی مہینے گذر گئے اور میں اس کے بارے میں تقریباً سب کچھ فراموش کر چکا تھا کہ ایک صبح ابھی عدالت کے معمولات نہ شروع ہوئے تھے کہ چاند آ گئی اور سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"بھیّا میں آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کر رہی۔"

"قطعی نہیں تشریف رکھیے۔"

اُس نے سامنے دیوار پر نظریں گاڑ دیں اور بولی۔ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔

"قدم قدم پر لٹو ناچتے نظر آتے ہیں ـــــ میرے لئے عجیب مصیبت ہے"، پھر اُس نے ایک دم مجھ سے سوال کیا۔

"آپ نے لٹّو ناچتے دیکھے ہیں ؟"

"وہ جو بچّے نچاتے ہیں"۔

"ارے نہیں ـــ جب کوئی مجھ سے اظہارِ عشق کرتا ہے تو نہ معلوم کیوں مجھے اس کا چہرہ ناچتے ہوئے لٹّو کی طرح نظر آتا ہے اور ہر روز کوئی نا کوئی لٹّو ناچتا ضرور ہے، شاید ہی کوئی دن خالی جاتا ہو۔ آخر ایسا کیوں ہے"۔

وہ سنجیدہ ہوگئی۔ اُس کے پتلے پتلے ہونٹ جو طنزیہ انداز میں مسکراتے تھے کانپنے لگے۔ تھوڑی دیر بال پن سے کھیلتی رہی پھر بولی۔ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔

"جب بھی کسی سے دو باتیں ضرورتاً یا اخلاقاً کر لیتی ہوں۔ ایسے لوگ دل ہتھیلی پر رکھ کر سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ طرح طرح کی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ نظریں بچا بچا کر دیکھتے ہیں جب مجھ سے نظریں ملتی ہیں تو شرمانے کی بھونڈی کوشش کرتے ہیں اور سب سے خطرناک وہ وقت ہوتا ہے جب کوئی نیا نویلا عاشق پکچر دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ میں سمجھ لیتی ہوں کہ اب اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر کر اعلانِ عشق کرے گا۔ کبھی کبھی میں پکچر کی دعوت اس طرح رد کرتی ہوں کہ اعلانِ عشق گلے میں گھُٹ کر دم توڑ دیتا ہے اور بے چارہ عاشق ہونٹوں پر زبان پھیر کر تھوک نگلتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سائیکل کے پھولے ہوئے ٹیوب کا والو اچانک نکال لیا گیا ہو"۔

میں اس کا منہ حیرت سے تک رہا تھا۔ وہ جیسے مدت سے بھری بیٹھی ہو۔

"کچھ لوگ جو کچھ ہیں وہ نظر نہیں آتے۔ کچھ لوگ جو کچھ ہیں عین مین وہی نظر آتے ہیں۔ میں دوسری قسم کے لوگوں کو پسند کرتی ہوں۔ ان میں سے کسی نے مجھ سے اعلانِ عشق نہیں کیا وہ میرا احترام کرتے ہیں۔ میں جب انھیں بھیّا کہتی ہوں وہ مجھ سے بھائیوں کی طرح پیش آتے ہیں اور پہلی قسم کے لوگ ایک دوسرے کو کہنی مار کر کہتے ہیں"۔

"سالی بھیّا کہتی ہے"۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہی۔

"یہ خوبصورت شیو کیئے ہوئے چہرے۔ سنہری کمانیوں کی عینک والے چہرے اسٹف کالرز کے اوپر کب تک لٹوؤں کی طرح ناچتے رہیں گے"۔

اس دن چاند نے مجھے بتایا کہ اس کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے ہے جس کے بزرگوں کا نام اردو ادب کی تاریخ میں زندہ رہے گا۔ اس کی پرورش بیٹوں کی طرح ہوئی ہے اور اسی لیئے اس نے اس پیشے کا انتخاب کیا تھا۔ اس پیشے نے اسے بہت کچھ دیا ہے۔ قدم قدم پر اُسے ایسے لوگ ملے ہیں۔ جو بظاہر بڑے بااصول اور انسان دوست ہیں لیکن اندر سے نرے کھوکھلے اور بے انتہا خود غرض ہیں۔ ایسے لوگ بھی۔ ملے ہیں۔ جن کی سفید قمیضوں کے کالر اُدھڑے ہوئے ہیں اور ان پر پسینے اور میل کے دھبے نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کے سیاہ کوٹ کی آستینیں کہنیوں پر گھس کر ادھڑ گیئ ہیں۔ ان کے جوتوں کی ایڑیاں اس قدر گھسی ہوتی ہیں کہ باوجود کوشش کے چلتے وقت توازن برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ اتنا کچھ پڑھنے کے بعد جب یہ عملی زندگی میں آئے تو معلوم ہوا کہ ان کی آمدنی کا تناسب دلالوں سے بھی کم ہے اور اس مستقل زبوں کا کوئی حل نہیں۔ زندگی اصل روپ میں سامنے آگئی ہے اور قمیض کے کالر بالکل زندگی کی طرح لچ لچے اور بوسیدہ ہو گئے ہیں"۔

وہ مغموم اور رکیلی ہوئی روح جو ایک خوبصورت جسم میں قید تھی مجھے بڑی پیاری محسوس ہوئی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اسے کوئی دکھ ہے اور وہ یہ دکھ مجھ سے بیان کرتی ہے۔ میں نے سوچا میں اُسے کہہ دوں چاند تو مجھے بیحد پیاری لگتی ہے۔ میں تجھ سے پیار کرتا ہوں۔ میں تجھے چاہتا ہوں۔ لیکن میری نگاہوں کے سامنے لٹو ناچنے لگے۔

اُس دن چاند نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور ہم ایک حد تک۔ بے تکلف ہو گئے۔

ایک شام جب میں چاند کے گھر پہنچا تو وہ لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سبزہ کو پانی دیا گیا تھا۔ ماحول میں۔ ہری گھاس۔ گیلی مٹی اور چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ آس پاس گرمیوں کی شام کا بوجھل سکوت تھا۔ بنگلے کے پچھلے حصے سے بچوں کا شور

سنائی دے رہا تھا۔ لان میں بے ترتیبی سے تین چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ چاند ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور دوسری کرسی پر دونوں پیر رکھے ہوئے تھے۔ زانو پر کلاسیکی موسیقی سے متعلق کوئی کتاب رکھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر حسب معمول مسکرائی اور کتاب ایک طرف رکھ دی۔

”آیئے —— وہ کیا شعر ہے۔ وہ ہمارے بنگلے پر آئیں خدا کی قدرت ہے —— یوں ہی ہے نا شعر۔“

”ہاں —— کبھی آپ ہم کو کبھی لان کی گھاس کو دیکھتے ہیں۔“

”خیر گھاس واس تو نہیں۔ یہ تو شعر کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ دراصل مجھے شعر یاد نہیں رہتے۔“

میری شادی کا سلسلہ چل رہا تھا اور میں یہ طے کرکے آیا تھا کہ آج چاند سے فیصلہ کن گفتگو کرنے کے بعد یہاں سے جاؤں گا۔

جب چائے آگئی تو میں نے چاند سے کہا۔

”تم مجھے بے حد پسند ہو۔“

”پھر کیا ہوا۔“

”میں تمہیں بے حد پسند کرتا ہوں چاند۔“

”یہ تو آپ پہلے کہہ چکے ہیں۔ دونوں جملوں میں کیا فرق ہے۔“

”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

”اے ——“ اس نے بظاہر حیران ہوکر کہا۔

”ہاں چاند میں تم سے واقعی محبت کرتا ہوں۔“

”لٹو ناچتے دیکھے ہیں۔“

”چاند میں قطعی سنجیدہ ہوں۔“

”آپ واقعی محبت کرتے ہیں۔“

”ہاں۔“

”تو ٹھنڈی آہ بھر کر، دکھایئے۔“

مجھے غصہ آگیا اور اتنی زور کا سانس کھینچا کہ میرے نتھنے سائیں سائیں کرنے لگے، اور میرے پھیپھڑے دکھنے لگے۔

"میں نے تو ٹھنڈی آہ بھرنے کو کہا تھا۔ یہ تو سخت گرم تھی۔ اندر لو چل رہی ہے کیا؟"

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں"

"تو ٹھنڈی آہ بھر کے دکھایئے نا۔ فریج میں لگی ہوئی۔ آئس کریم کھائی ہے کبھی؟"

"شٹ اپ" میں ایک دم اٹھا اور گیٹ کی طرف چل دیا۔

"سنئے ـــ سنئے تو ـــ اللہ لوٹ آیئے۔ آپ واقعی ناراض ہو گئے کیا؟"

وہ میرے پیچھے گیٹ تک آئی لیکن میں بنگلے سے باہر آگیا۔

اُس شام کے بعد تیسرے ہفتے ہی میری شادی طے ہو گئی۔ میں نے قصداً چاند کو بھی دعوت نامہ بھیج دیا ان تین ہفتوں میں عدالت کے کمرے، کوری ڈور اور سیڑھیوں پر جب بھی چاند مجھے نظر آتی۔ میں راستہ بدل دیتا یا کترا کر نکل جاتا۔

جس دن میں نے چاند کو دعوت نامہ بھیجا تھا۔ اس کے دوسرے دن ابھی عدالت کے معمولات شروع بھی نہ ہوئے تھے۔ کہ چاند دعوت نامہ لئے ہوئے میری میز پر آئی رکھڑے کھڑے دعوت نامہ میز پہ اُچھال کر بولی۔

"تم نے سمندر کی سطح کا سکوت ہی دیکھا ہے۔ گہرائیوں تک تمہاری بھی نگاہیں نہیں پہنچ سکیں۔ میں نے غلط سمجھا دوسروں میں اور تم میں کوئی فرق نہیں۔ مجھے میری پہلی غلطی کی سزا مل گئی۔ پہلا زخم جتنا گہرا ہے خلش اتنی ہی لطیف ہے۔ مجھ سے محبت کی تھی تو والدین سے شادی کی بات کرتے"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آواز بھرا گئی وہ چپ چاپ کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں اس دروازے کو دیکھتا رہا۔ جس سے چاند ابھی شیفون کے سفید ڈوپٹے سے آنسو خشک کرتی ہوئی باہر نکلی تھی۔ میز پہ میرا دعوت نامہ پڑا تھا۔ میں نے لفافے سے دعوت نامہ نکال کر بے خیالی میں دیکھا دعوت نامے کے سادہ صفحہ پہ چاند نے

بال پن سے لکھا تھا۔
"بہار آ کر چلی جائے تو کس کو غم نہیں ہوتا۔"

○

وہ سعیدہ افروز علی خاں کو اس کی خوشبو سے پہچان سکتا تھا۔ وہ اکثر سوچتا یہ لڑکیاں اپنی شکل وصورت اور عادت کی طرح اپنی خوشبوؤں میں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ اُسے ہر لڑکی کی خوشبو سے ایک طرح کا پیغام ملتا تھا۔ جیسے سعیدہ افروز علی خاں کی خوشبو میرا احترام کرو کا پیغام دیتی ہو جیسے ریحانہ کاظمی کی خوشبو میرا انتظار کرو کہتی ہو اور جیسے شیریں کی خوشبو میں موجود ہوں کا احساس دلاتی ہو۔

دلدل ——————

دلدل

سعیدہ افروز علی خاں گرلز کامن روم کی طرف آرہی تھی۔

امامی آنکھوں کے نیچے اُبھری ہوئی ہڈی پر اُگے ہوئے بالوں کو موچنے سے اکھاڑتے اکھاڑتے ایک دم رُک گیا۔ موچنا جیب میں ڈال کر کامن روم کے دروازے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ سامنے پتلی سی راہ دری میں پختہ فرش پر اُونچی ایڑیوں کے جوتے کھٹکھٹاتی، اپنی مخصوص مسکراہٹ بکھیرتی سعیدہ افروز علی چلی آرہی تھی۔ امامی کو ایسا محسوس ہوا جیسے ماحول میں اچانک کوئی تبدیلی آگئی ہو۔ ہمیشہ کی طرح اُس کا دل اِس شدت سے دھڑکنے لگا کہ دھڑکن کی آواز واضح اُس کے کانوں کو سنائی دینے لگی۔ وہ ڈرا کہ کہیں دل کے اس طرح دھڑکنے کی آواز سعیدہ افروز علی خاں کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ اُس کے کمزور سینے سے کھانسی کا بھبکا اٹھا جسے اُس نے پوری قوت سے دبا لیا۔ گلے میں بلغم کی سرسراہٹ ہوئی جسے نگل کر امامی نے سعیدہ افروز علی خاں کو سلام کیا وہ مسکرائی۔ امامی کی خیریت پوچھی اور کامن روم کا پردہ اٹھا کر اندر چلی گئی۔ اندر کامن روم میں لڑکیاں

گنگناتی رہتیں، بحثیں کرتی رہتیں، چائے کی پیالیاں کھنکتی رہتیں اور ٹیبل ٹینس کی گیند ٹیبل پر ٹِک ٹِک کرتی رہتی اور امامی کامن روم کے باہر اسٹول پر بیٹھا آنکھوں کے نیچے اُگے ہوئے فالتو بالوں کو موچنے سے اکھاڑتا رہتا جو اس بات کی علامت تھی کہ کامن روم ٹھیک ٹھاک ہے۔

وہ کامن روم کے باہر اسٹول پر بیٹھا سوچتا رہتا۔ کامن روم کی رنگ برنگی تتلیوں جیسی لڑکیوں کے بارے میں، اپنے ماضی کے بارے میں، اُس گاؤں کے بارے میں جسے وہ چھوڑ آیا تھا اور اپنے خشک ہاتھوں، گوشت چھوڑ کر لٹکتی ہوئی جلد اور دن پر دن پھٹتی ہوئی آواز کے بارے میں اُسے یقین نہ آتا کہ جسم کی تہمت کے طور پر اب جو ہڈیوں کا پنجر اٹھائے پھر رہا ہے یہ اُسی امامی کا جسم ہے جسے لوگ رشک سے دیکھتے تھے جب وہ ململ کا کرتا اور رنگی پہن کر کاندھے پر چھ فٹ کی لاٹھی رکھ لیتا تو کوئی اُس سے آنکھیں نہ ملا سکتا تھا۔ اُس وقت اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس کی ذات اور اُس کے وجود کے علاوہ ہر چیز کمتر اور کمزور ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ سب کچھ پا سکتا ہے لیکن اب جب کہ اُس کا گاؤں نہ تھا، شباب نہ تھا اور اپنے اوپر اعتماد نہ تھا جب وہ کامن روم میں چمکدار سڈول بازو تنگ آستینوں سے باہر جھولتے ہوئے دیکھتا جن کی چکنی چمکدار جلد اُس کی آنکھوں میں تیز روشنی کی طرح کھبنے لگتی، کھنکتی ہوئی آوازیں سنتا جن میں مقدس کنواریوں کے گیتوں کا رس ہوتا تو اُسے جان لیوا مایوسی گھیر لیتی۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے چست لباسوں میں پھنسے ہوئے خوبصورت جسم ناچتے رہتے اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کامن روم تازہ خوشبودار مالٹوں سے بھرا ہوا ہے اور اُس کا گلا خشک ہونے لگتا اور سینے میں میٹھا میٹھا بھولا بسرا درد ہونے لگتا۔

امامی ایک سال قبل کامن روم کے چپراسی کی حیثیت سے ملازم ہوا تھا۔ اُس کی پرورش گاؤں کی کھلی فضا میں ہوئی تھی۔ گاؤں میں اُس کی جوانی اُس کی جرأت اور اُس کے گیتوں کا ذکر ہر جوان لڑکی کرتی تھی۔ جوانی میں اُس نے دھرتی کا سینہ چیر کر دانے اُگائے تھے اور دانوں کو بیلوں سے روندتے ہوئے آم کے درختوں کی گھنیری چھاؤں میں والہانہ

گیت گائے تھے۔ برسات کے دنوں میں برستے ہوئے پانی میں جھکے ہوئے بادلوں سے لدے ہوئے آسمان کے نیچے اپنے مست جھومتے ہوئے بیلوں سے سوندھی سوندھی خوشبو لنڈھاتے ہوئے کھیتوں کو جوتا تھا۔ پھر گلے میں جھولی ڈال کر اُن جتے ہوئے کھیتوں میں بیج ڈالے تھے اور کھیت میں ننھے ننھے پودوں کو لہلہاتا ہوا دیکھ کر محبت اور خوشحالی کے گیت گائے تھے۔

گوری یہ بادل ترا سندیس لائے ہیں۔
ان ہواؤں میں تیری بو رچی ہوئی ہے۔
میرے کانوں تک، ترے پائل کی آواز آرہی ہے۔
تو میری راہ دیکھ رہی ہے۔
اب کھیتی پک جائے گی۔
تیرے ہاتھ مہندی سے لال ہو جائیں گے۔
اور میں تیرے گاؤں تجھے بیاہنے آؤں گا۔

اُس نے یہ گیت بڑے جذبے اور جوش سے گائے تھے۔ یہ گیت گاتے ہوئے اُس کے گلے کی نسیں پھول جاتیں اور چہرا تمتما جاتا۔ اور بازو کی مچھلیاں پھڑکنے لگتیں اور کھلیان میں غلے کے چمکتے ہوئے ڈھیر دیکھ کر سوچتا اس سال نیا چھپّر پڑ جائے گا۔ کپڑے آجائیں گے اور بلکی کی ماں کے لئے شال اور بلکی کے لئے چھوٹی چھوٹی آٹھ چوڑیاں آجائیں گی لیکن وہ ساری زندگی یک لخت خواب ہو گئی۔ اُس کے کھیت چھن گئے۔ بیل چلے گئے اور گیت جل گئے۔ پچھتاوا تو یہ تھا کہ اُس نے خود اپنی ان جہنمی چیزوں سے نگاہیں پھیری تھیں۔ لہلہاتی ہوئی کھیتیوں سے اُس نے خود منہ موڑا تھا۔ بیلوں کی رسی اپنے ہاتھوں دوسروں کو دی تھی۔ اپنی زمین خود اپنے پیروں چل کر چھوڑ آیا تھا۔ وہ کسی سے بے وفائی کا شکوہ نہ کر سکتا تھا۔ اُسے تو گاؤں کی ایک ایک شے نے اپنی طرف بلایا۔ گیہوں کی بالیوں نے اُس کا دامن پکڑا، راستے کی دھول نے اُس کے قدم روکے اور پنگھٹ کی آوازوں نے اسے اپنی طرف بلایا مگر وہ سب سے نگاہیں چرا کر تمام آوازوں

سے کان بند کر کے گاؤں چھوڑ آیا اور ایک بہت بڑے شہر میں آ گیا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ جہاں وہ جا رہا ہے وہاں دودھ کی نہریں ہوں گی، انگوروں کے خوشے ہوں گے، خوشبو ہوگی، ٹھنڈک ہوگی، امن ہوگا، سچائی ہوگی اور انصاف ہوگا۔ لیکن جب وہ اتنے بڑے شہر میں آیا تو وہاں سب کچھ عجیب تھا۔ کوئی نہر نہیں تھی، کوئی خوشبو نہیں تھی، امن اور سچائی بھی اُسے نہ ملی۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر آ گیا اور اب اُس کے ہاتھ میں ٹھیکرا تھا، آنکھوں میں اجنبیت تھی، بھوک تھی اور ہوس تھی۔ وہ ایسے جانے پہچانے چہرے کی تلاش میں تھا جس سے وہ پوچھ سکے کہ وہ دودھ کی نہریں امن اور سچائی جس کا وعدہ کیا تھا وہ کہاں ہیں۔ ہمارا سب کچھ چھین کر ہمارا نام بدل کر ہمارے ہاتھوں میں ٹھیکرے دے کر کیا ملا۔ اُس کے اس ٹھیکرے میں کسی نے چپراسی کی ملازمت ڈال دی اور وہ کامن روم کا چپراسی ہو گیا۔ بلکی کی ماں گاؤں ہی میں مر گئی تھی اب صرف اُس کے ساتھ بلکی رہ گئی تھی۔ وہ دونوں اس چھوٹی سی ملازمت سے کسی نہ کسی طرح دن گذار لیتے۔ اُس کے ہاتھ دن بہ دن سوکھتے جا رہے تھے گلے میں ہر وقت بلغم پھنسا رہتی تھی اور کھال گوشت چھوڑ کر لٹکنے لگی تھی۔ گاؤں میں رہتا تو شاید اسّی سال تک اس طرح نہ گھلتا جب کہ شہر میں صرف پینتالیس سال کی عمر میں بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں" وہ اکثر سوچتا۔ "گاؤں چھوڑ کر تو وہ ساری دنیا میں اجنبی ہو گیا۔ اُس کے جانے پہچانے لوگ ایک دم بدل گئے اور وہ خارش زدہ کُتے کی طرح اپنوں اور بیگانوں سب کے لئے قابلِ نفرت بن گیا۔ وہ جس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ایک گہری سوچی سمجھی ہوئی اجنبیت اور بیگانگی نظر آتی۔ گاؤں میں تو کالے کوسوں سے آتے ہوئے راہ گیر کی آنکھوں میں بھی اتنی اجنبیت اور ناپسندیدگی نہ ہوتی۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں" ——— "یہ کیسا دھوکہ ہے یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے۔ یہ تو بس منہ اُٹھائے لوہے کے پرزوں کی طرح بے حس بھاگنے والوں کی دنیا ہے۔ یہاں سب ایک دوسرے کے پیچھے منہ لٹکائے بھاگے جا رہے ہیں۔ سب کے منہ لٹکے ہوئے ہیں اور جو لوگ ہنس رہے ہیں مسکرا رہے ہیں اندر سے اُن کے بھی منہ لٹکے ہوئے ہیں۔ یہاں جو سب کچھ کھو

چکے ہیں انہیں کھونے کا غم کھائے جا رہا ہے۔ جو بہت کچھ پا چکے ہیں انہیں یہ احساس ہے کہ وہ اور زیادہ کیوں نہ پا سکے وہ اور پا لینے کی جستجو میں مرے ہیں۔ یہ کھونے کا احساس سانس کی طرح سب کے سینوں میں رچ بس گیا ہے۔ یہ کھونے والوں کا غم ہے۔ یہ کم پانے والوں کا غم ہے یہ بہت کچھ پا کر اور پا لینے کی خواہش کا غم ہے۔ یہ لوگ بہت دکھی ہیں۔ لیکن اُسے یقین تھا کہ وہ سب سے زیادہ دکھی ہے۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو چند لمحوں کے لئے اُسے جو کچھ ملتا تھا دن کا آفتاب طلوع ہونے سے قبل ہی اُس سے چھن جاتا اور پھر اُس کے خالی ہاتھ ایک مہینے تک نئی پہلی کے انتظار میں پھیلے رہتے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں اُس کے خون کی گردش کی طرح نس نس میں پھیل جاتیں اور اُس کی موہوم اُمیدوں کو چاٹنے لگتیں۔ اُس کی بلکی چپ چاپ اُس کا خالی ہاتھ گھر آنا دیکھتی رہتی اور آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں پہلی تاریخ کے ساتھ آئی ہوئی چمک معدوم ہو جاتی پھر ریشمی کپڑوں اور چوڑیوں کی خواہش آئندہ آنے والی پہلی تاریخ کا انتظار بن جاتی۔ لیکن کم پیسوں کے باوجود وہ یہ ملازمت چھوڑ کر کوئی اور ملازمت کرنا پسند بھی نہ کرتا تھا۔ اُس کے پیر میں کام من رم نے بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ یہاں سعیدہ افروز علی خاں تھی، ریحانہ کاظمی تھی، شیریں اور بہت سی دوسری لڑکیاں تھیں جو اُسے بے حد اچھی لگتی تھیں۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے کام کر کے اسے بے اندازہ خوشی ملتی تھی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ سعیدہ افروز علی خاں کے سارے کام خود اپنے ہاتھوں سے کرے۔ وہ اُس سے باتیں کرتی رہے اُسے اپنے کاموں کی تفصیل سمجھاتی رہے اور وہ اُس کے قریب کھڑا اُس کے کپڑوں میں لگے ہوئے سینٹ اور اُس کی سانسوں کی مہک محسوس کرتا رہے۔ اُسے یہ خوشبو ہمیشہ یاد رہتی۔ وہ سعیدہ افروز علی خاں کو اُسکی خوشبو سے پہچان سکتا تھا۔ وہ اکثر سوچتا یہ لڑکیاں اپنی شکل وصورت اور عادت کی طرح اپنی خوشبوؤں میں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ اُسے ہر لڑکی کی خوشبو سے ایک طرح کا پیغام ملتا تھا۔ جیسے سعیدہ افروز علی خاں کی خوشبو میرا احترام کرو کا پیغام دیتی ہو۔ جیسے ریحانہ کاظمی کی خوشبو میرا انتظار کرو کہتی ہو اور جیسے شیریں کی خوشبو میں موجود ہوں کا احساس دلاتی ہو۔

اماّمی اِن لڑکیوں کو دیکھتا اور سوچا کرتا کہ انہیں شہروں کے خدا نے بنایا ہے۔

یہ گاؤں کی لڑکیوں کے مقابلے میں کتنی سُبک، سجل اور نازک ہیں۔ شاید شہروں کا خدا گاؤں کے خدا سے زیادہ مشاق اور ہنرمند ہے۔ اُس کے گاؤں کی لڑکیاں تو جیسے لونا لگی ہوئی دیوار کی طرح بھُس بھُسی اور بھدی ہیں۔ چلتی ہیں تو جیسے سارے بدن کے گوشت کو بگھار دیتی ہوں۔ جیسے جسم قابو میں نہ ہو۔ اُسے شہر کی لڑکیاں گندھے ہوئے سفید میدے کی طرح لسدار محسوس ہوتیں۔ شاخ کی طرح لچکتی ہوئی تازہ پھولوں کی طرح مہکتی ہوئی اور چڑیوں کی طرح چہکتی ہوئی جنہیں میلی ہونے کے خیال سے چھوتے ہوئے ڈر لگے۔ اُس کی بلکی بھی بارش میں بھیگی ہوئی کچی دیوار کی طرح لدلد گرتی ہوئی سی تھی اور بلکی کی ماں تو ہمیشہ پھٹے ہوئے دودھ کی طرح باس دیتی رہتی۔ اور اب اُس کے گرد رات کی رانی کی طرح مہکتی، چشموں کی طرح گنگناتی اور گندم کی بالیوں کی طرح ہوا سے جھومتی ہوئی لڑکیاں ساون کی اندھیری راتوں کی بجلی کی طرح کوندرہی تھیں اور اسی لئے کم تنخواہ کے باوجود اُسے یہ نوکری بہت پسند تھی۔

سعیدہ افروز علی خان اُس پر کس قدر مہربان ہے۔ اُس کی خیریت دریافت کرتی ہے۔ اُس سے مسکرا کر دھیمے دھیمے لہجے میں اس طرح باتیں کرتی ہے جیسے اپنوں سے باتیں کی جاتی ہیں۔ وہ اس سے اپنے خطوط پوسٹ کراتی ہے۔ اپنے دوستوں کو پیغام بھجواتی ہے۔ وہ اُس پر آخر بے سبب اتنا اعتماد تو نہیں کرتی۔ بے وجہ تو اس قدر مہربان نہیں ہے۔

پھر اچانک اُس نے ایک اور انداز سے سوچنا شروع کیا۔

وہ اسی لئے تو اس کامن روم میں ملازم رکھا گیا ہے کہ ان لڑکیوں کے کام کرے اُس کو انہیں خدمات کے صلے میں تنخواہ ملتی ہے۔ پھر مالک اور نوکر میں کام اور مزدوری کے علاوہ اور دوسرا رشتہ ہو بھی کیا سکتا ہے اور مسکرا کر حکم دینا اور تکمیل پر شکریے کے خوبصورت الفاظ سے حوصلہ افزائی کرنا پڑھے لکھے لوگوں کی عادت ہے۔

لیکن وہ اپنے اس خیال سے متفق نہ ہو سکا۔

سعیدہ افروز علی خاں بڑی ہنس مکھ اور خوبصورت لڑکی ہے۔ اُس نے سوچا۔۔۔

اُس کے بالوں میں جنگل کی راتوں جیسی سیاہی ہے۔ آنکھوں میں تازہ کھلے ہوئے گلاب جیسی تازگی ہے۔ اس کے بدن سے شعاعیں پھوٹتی رہتی ہیں جیسے جاڑے کی راتوں میں جگنو اُڑ رہے ہوں۔ وہ چلتی ہے تو آنکھوں کے سامنے شاخیں سی لچکنے لگتی ہیں، وہ ہنستی ہے تو ذہن میں تارے جگمگانے لگتے ہیں۔ جب باتیں کرتی ہے ارد گرد بنسری کی لے سی گونجنے لگتی ہے۔ اماں کا بھولا بسرا درد اُس کے جسم میں خون کی گردش کے ساتھ پھر گیا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

"میں سعیدہ افروز علی خاں سے محبت کرتا ہوں۔ میں اس سے شادی کر سکتا ہوں وہ میرے بچوں کی ماں بن سکتی ہے۔ اِن الفاظ کے ساتھ ہی اُس کا جسم شدتِ جذبات سے اکڑ گیا۔ اُس کی بوٹی بوٹی سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

"تو چپراسی ہے اپنی اوقات دیکھ" کہیں دور سے آواز آئی اور وہ تڑپ گیا۔

"تو کیا ہوا۔ ہوں تو انسان ہی"

"تو بڑھاپے کی سرحدوں میں پہنچ چکا ہے"۔ دور کی آواز نے پھر اُسے ہلا دیا۔

"یہ غلط ہے۔ میں بوڑھا بھی نہیں ہوں۔ بلکی کی ماں اگر زندہ ہوتی تو اب تک ننھے مُنّے بچوں کا سلسلہ جاری ہوتا"

پھر اُس نے ریحانہ کاظمی کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

وہ کس قدر شوخ ہے۔ چلتے چلتے ہواؤں کو چٹکیاں لے لیتی ہے۔ فقرے تو جیسے اُس کی زبان کی نوک پر سجے ہوئے تیار رہتے ہیں۔ وہ اکثر کہتی ہے امامی تم تو بالکل امامی نہیں لگتے ایڈیٹ لگتے ہو۔ وہ ایک دم چکرا گیا تھا اور جب اُسے ایڈیٹ کے معنی کسی نے بتلائے تو وہ افسردہ ہو گیا۔ پھر ایک دن ریحانہ کاظمی نے کہا امامی تم بہت گریٹ ہو اور جب تک اُسے گریٹ کے معنی نہ معلوم ہوئے وہ کڑھتا رہا۔ لیکن بعد میں خوش ہو گیا اور اُس نے ہر آدمی کو انہیں دو خانوں میں رکھنا شروع کر دیا۔ جو آدمی اُسے اچھا لگتا اُسے گریٹ کہتا اور جو اُسے اچھا نہ لگتا وہ ایڈیٹ ہوتا۔

ریحانہ کاظمی ایک دبلے پتلے سے لڑکے کو امامی کے ذریعہ خوشبو میں بسے ہوئے

خط بھجواتی اور ساتھ ہی کچھ پیسے بھی دے دیا کرتی تھی۔ امامی خط دینے کے بعد تمام دن اپنی مہکی ہوئی انگلیاں سونگھتا رہتا اور کڑھتا رہتا۔ وہ سوچا کرتا کہ آخر وہ کیوں یہ خط اُس لڑکے کو دے آتا ہے۔ ان خطوں میں ریحانہ کاظمی اپنے عاشق کو نہ جانے کیا کچھ لکھتی ہوگی۔ آخر ریحانہ کاظمی ایسے خط اُسے کیوں نہیں لکھتی۔ اُس دبلے پتلے کمزور سے لڑکے میں کیا رکھا ہے۔ شاید اُس کے پاس موٹر سائیکل ہے اس لئے ریحانہ کاظمی اُسے پسند کرتی ہے۔ یا شاید اُس کا رنگ میدے کی طرح سفید ہے اس لئے اُسے چاہتی ہے مگر وہ عین مین لڑکیوں کی طرح نازک ہے اور اُسی طرح سنگھار کرتا ہے۔ ریحانہ کاظمی کو تو ایک طاقتور مرد کو پسند کرنا چاہئے۔ یہ لڑکیاں پتہ نہیں کیسی ہیں اور ان کی پسند کیا ہے۔ وہ اپنے ڈیل ڈول اور جسم پر نظر ڈالتا اور غصّہ سے زمین پر تھوک کر مطمئن ہو جاتا۔

اور پھر اُسے شیریں یاد آئی۔

شیریں ڈیکسٹر کی دیوانی تھی۔ وہ اینگلو انڈین تھا اور کسی کالج میں پڑھتا تھا۔ اُس کی انگریزی سے شیریں بہت زیادہ مرعوب تھی وہ ہمیشہ انگریزی میں گفتگو کرتا اور شیریں اُس کا منہ تکے جاتی۔ وہ اپنی گفتگو میں اسٹیٹس، جرمنی، فرانس اور انگلینڈ کے حوالے اِس کثرت سے دیتا کہ شیریں غریب نڈھال ہو جاتی اور اُسے اپنی پس ماندہ زندگی سے نفرت ہونے لگتی۔ وہ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ اپنی شخصیت سے کاٹ کر جدا کر دینا چاہتی تھی مگر وہ اُس سے کسی طرح جدا نہ ہوتا۔ ڈیکسٹر کے ساتھ تھوڑی دیر انگریزی بولنے کے بعد چپ ہو جاتی، اُس کا لباس اُس کی پس ماندگی کی تشہیر کرتا۔

”یہ تو بڑا بیک ورڈ ملک ہے۔ یہاں کے لوگ جاہل، غریب اور وحشی ہیں۔“ ہے نا ڈیکسٹر ڈارلنگ“۔ وہ کہتی۔

”یو آر رائٹ سوئیٹی۔“

اور ساتھ ہی ڈیکسٹر کے ذہن میں اپنے دو کمرے کے چھوٹے سے فلیٹ کا نقشہ پھر جاتا جس کے ایک کمرے میں ڈرائنگ روم تھا جہاں یسوع مسیح کی تصویر رکھی ہوئی تھی اور رات میں صوفے اور سنٹرل ٹیبل کھسکا کر وہ سو جایا کرتا تھا اور دوسرے کمرے میں

اُس کی ماں اور بہنیں کھٹملوں اور مچھروں کی وجہ سے رات بھر اپنا جسم کھجاتی اور بڑبڑاتی رہتی تھیں اور اُس کا باپ شراب کے نشے میں دھت اپنی بیوی کو آوازیں اور گالیاں دیتا رہتا تھا۔

"ہم شادی کے بعد یہ ملک چھوڑ دیں گے۔" شیریں کہتی۔

"شیور، شیور۔ دی دل گو ٹو شکاگو" ڈیکسٹر کہتا۔

ڈیکسٹر سے ملاقات کے بعد شیریں نے ڈوپٹے کا استعمال ختم کر دیا تھا۔

امامی اُس کی پھنسی ہوئی قمیض میں اُسے جب بھی چلتا ہوا دیکھتا اس کے سر پہ جیسے کوئی کیلیں ٹھونکنے لگتا۔ اُسے مالٹوں کا رس چھلکتا ہوا محسوس ہوتا اور اُس کا گلہ خشک ہونے لگتا۔

شیریں کے سلسلے میں امامی کی اذیت پسندی بے سبب نہ تھی۔ وہ سعیدہ افروز علی کو پسند کرتا تھا۔ ریحانہ کاظمی اُسے اچھی لگتی تھی اور کامن روم کی بہت سی لڑکیوں کو وہ اپنے ذہن میں سجائے رہتا تھا لیکن شیریں کو دیکھتے ہی وہ وحشی سا ہو جاتا اور امامی کی حد سے بڑھی ہوئی دیوانگی شیریں کی اپنی غلطی کی وجہ سے تھی۔

گرمیوں کی دوپہر تھی۔ سب ہی جا چکے تھے۔ کامن روم ویران پڑا ہوا تھا۔ امامی کامن روم کی صفائی کرا کے اُسے بند کرنے والا تھا کہ شیریں اور ڈیکسٹر دبے پاؤں گریز کامن روم میں داخل ہوئے۔ امامی کامن روم کی لائٹ بجھا چکا تھا۔ اُسے اِن دونوں نے الماری کے پیچھے جھاڑن رکھتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ ڈیکسٹر نے کامن روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور شیریں پر ٹوٹ پڑا۔ الماری کے پیچھے امامی کو سکتہ ہو گیا۔

ڈیکسٹر شیریں کو کھینچتا ہوا کامن روم کے درمیان پڑی ہوئی ٹیبل ٹینس کی میز تک لے گیا۔ دو تنوں کے بوجھ سے میز نے ہلکا سا احتجاج کیا لیکن شیریں سے وہ بھی نہ ہو سکا۔ اس نے آنکھیں موند لیں کمرہ دونوں کے جارحانہ تنفس سے بھر گیا۔ امامی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے ٹیبل ٹینس کی میز ناچنے لگی۔ کمرے کی دیواریں سمٹیں اور پھر پھیلنے لگیں اور اُس سے دور ہوتی چلی گئیں۔ الماری جس کے پیچھے وہ کھڑا تھا۔

اُس کے قریب آنی گئی اور اُسے پیسنے لگی۔ ہر چیز ہوا میں معلق ہو گئی۔ پھر ہر شے غائب ہو گئی۔ نہ میز رہ گئی نہ کمرہ رہ گیا نہ الماری رہ گئی صرف ننھے کبوتر ذہن میں پھڑ پھڑانے لگے۔ پھر کبوتر اُڑتے ہوئے آئے شیریں کے جسم پر بیٹھ گئے۔ اب شیریں اکیلی تھی ڈکیسٹر جا چکا تھا میز پر شیریں دھنکی ہوئی روئی کی طرح ڈھیر تھی۔ امامی کے جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں اچانک روئی سمٹی اور اُس میں جان سی پڑ گئی۔ شیریں اٹھی میز پر بیٹھے بیٹھے اُس نے خواب آلود نگاہوں سے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ الماری کے پیچھے نیم تاریک گوشے میں امامی صورتِ سوال کھڑا تھا۔ شیریں کی آنکھیں سکڑ گئیں، چہرہ تاریک ہو گیا ہونٹ کاغذ کی طرح سفید ہو گئے۔ اس نے لباس درست کیا۔ کتابیں سمیٹیں اور کامن روم سے تقریباً بھاگتی ہوئی نکل گئی۔

اُس کے بعد جب بھی وہ شیریں کو دیکھتا اُس کے ذہن میں کبوتر پھڑ پھڑانے لگتے۔

اُس نے کئی بار سوچا کہ وہ شیریں سے سب کچھ کہہ دے۔ اُس پر اپنی بھوک کا اظہار کر دے لیکن جب اُسے ایک دن شیریں گیلری میں تنہا مل گئی تو اُسے دل کی بات کہنے کو الفاظ نہ مل سکے۔ وہ شیریں کا راستہ روک کر ڈھٹائی سے کھڑا تو ہو گیا لیکن اُسے اپنی بھوک کی شدت کا احساس نہ دلا سکا۔ اُس نے اپنے منتشر حواس جمع کئے لیکن زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ شیریں نے اُسے اپنا راستہ روکے ہوئے کھڑا دیکھا، اُس کی آنکھوں میں چمکتا ہوا سوال پڑھا اور اُسے وہیں انتظار کرنے کے لئے کہہ کر کامن روم میں چلی گئی۔

امامی کے لئے شیریں کی اتنی ہمت افزائی بہت تھی اُس کا دل اِس شدت سے دھڑکا کہ وہ دیوار کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ شیریں اُس کی خواہش پوری کرنے پر مجبور ہے اور اب جبکہ شیریں اُسے انتظار کرنے کے لئے کہہ گئی ہے وہ لمحہ آنے ہی کو ہے جس کے لئے اُس نے کئی کئی پہر بے چینی سے گذارے ہیں اُس لمحے کے لئے اُس نے جتنے تانے بانے بُنے تھے سب اُس کی نگاہوں کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

شیریں اور وہ

وہ اور شیریں

تنہائی

اُس کی بیزاری

شیریں کی مجبوری

اُس کی خواہش کا احترام کرنے پر مجبور۔

سارے سوچے ہوئے لمحے، تعمیر کئے ہوئے بت، دیکھے ہوئے خواب اُس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوئے تھے اور وہ اِن لمحوں، بتوں اور خوابوں کی یلغار میں گھرا ہوا دیوار کا سہارا لئے شیریں کا منتظر کھڑا ہوا تھا جو اُسے انتظار کرنے کے لئے کہہ کر جھپاک سے کامن روم میں چلی گئی تھی اور کسی لمحے نکل کر اُسے ساتھ لے کر چلی جانے والی تھی۔

شیریں کامن روم سے گھبرائی ہوئی باہر نکلی، امامی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ایک طرف لے گئی اور ریو آر ویری گڈ اور لڈ بوائے کہتے ہوئے اس کی ہتھیلی پہ پانچ روپے کا ایک نوٹ رکھ کر واپس کامن روم میں چلی گئی۔

شیریں نے کیا کہا امامی کی سمجھ میں نہ آیا۔ اُس کے جسم سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں، دماغ میں شیریں کی خوشبو بسی ہوئی تھی اور مٹھی میں پانچ روپے کا نوٹ دبا ہوا تھا۔ وہ معاملے کی نوعیت بھانپ گیا اور جھنجھلا گیا۔

”آخر یہ حرافہ اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ میرا بھی کچھ حق ہے۔ اُسے یہ سمجھنا چاہیئے اس میں اُس کا حرج بھی کیا ہے۔ اُسے کوئی اعتراض ہونا ہی نہ چاہیئے۔ ڈیکھٹر ہی کیو لیں میں کیوں نہیں“

شیریں کامن روم سے نکلی اور اُس کی طرف دیکھے بغیر کالج سے باہر چلی گئی امامی کو شیریں کا اس طرح نکل کر اُس کی طرف کوئی توجہ کئے بغیر چلا جانا اور بھی برا لگا۔

امامی ایک شکستہ سی جھونپڑی میں بلکی کے ساتھ رہا کرتا تھا جب سے اُس نے کامن روم میں ملازمت کی تھی بلکی اُسے گنوار اور پھوہڑ لگنے لگی تھی اُسے اس کا نام بلکی بھی بڑا عجیب سا لگتا۔ حالانکہ گاؤں کے مولوی نے اُس کا نام بلقیس جہاں رکھا تھا جسے سب نے بگاڑ کر بلکی کر دیا تھا۔ اب اُسے بلکی نام ذرا اچھا نہ لگتا تھا لیکن اُس کی ہمت

نہ پڑتی تھی کہ بیس سال بلکی کہنے کے بعد اب اُسے نئے سرے سے بلقیس جہاں کہنا شروع کر دے۔ پھر بھی اکثر وہ سوچا کرتا کہ بلکی بھی سعیدہ افروز علی خاں کی طرح ہر وقت مسکراتی رہے اور دھیمے دھیمے لہجے میں باتیں کرے۔ اس کے جسم سے پسینے اور لہسن کی بو کے بجائے ریحانہ کاظمی کی طرح سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو آئے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے بے ہنگم کپڑوں کی جگہ عمدہ سلے ہوئے کپڑے پہنے۔

اس نے ایک روز بلکی پر اپنے خیالات کا اظہار کر ہی دیا۔

"ری بلکی تو اتنی گندی کیوں رہتی ہے؟"

"ایں ابو" بلکی کو یہ بات عجیب سی لگی۔

"پگلی میں کہتا ہوں ذرا صاف رہا کر اور اچھے کپڑے پہنا کر۔"

"لیکن ابو میرے پاس کپڑے ہیں کہاں قمیضیں تو ساری پھٹ گئی ہیں۔"

اب امامی کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا سلیقہ سے رہنے، صاف ستھرے اور عمدہ سلے ہوئے کپڑے پہننے اور خوشبو میں بسنے کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بلکی کی بات سن کر خاموش رہا۔ اُس نے سوچا کہ اب اُسے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ اگر بلکی بھی اچھے لباس پہنے تو سعیدہ افروز علی خاں کی طرح —— لیکن نہیں سعیدہ افروز علی خاں تو اکہرے جسم کی لڑکی ہے۔ اُس کی بلکی —— اُس کی بلکی کا جسم تو عین مین شیریں کی طرح ہے۔ بھرا بھرا۔ دوہرا جسم۔ وہ بلکی کے لباس کے بارے میں سوچتے سوچتے سو گیا۔

صبح اُس نے پھر بلکی کو تنقیدی نظروں سے دیکھا اُسے بلکی کی شیریں سے مماثلت اچھی نہ لگی۔ لیکن اس وقت بھی جب وہ بلکی کو جھونپڑی میں چلتا پھرتا دیکھ رہا تھا تو اُسے اُس کا جسم بالکل شیریں کی طرح متحرک آپا دھاپی کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے بیس سال میں آج پہلی مرتبہ بلکی کو دیکھا ہو۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں کندن کی طرح دمکتے ہوئے چہرے پر بکھرے ہوئے بال اور لانبی گداز انگلیاں "کس قدر یکسانیت ہے دونوں میں" اُس نے سوچا۔

"میری بلکی میں تھوڑی سی تبدیلی کی ضرورت ہے پھر وہ کامن روم کی خوبصورت سے

خوبصورت لڑکی کا مقابلہ کر سکتی ہے۔"

امامی کی زندگی میں سائرہ کے مرنے کے بعد ایک خلا پیدا ہو گیا تھا اُس کے مرنے کا اُسے اتنا رنج ہوا تھا کہ اُس نے دوسری شادی نہ کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ امامی سے شادی کے وقت ملکی جو سائرہ کے پہلے شوہر سے تھی صرف دو سال کی تھی اس نے سائرہ کے انتقال کے بعد اُسے ماں کا پیار بھی دیا تھا اور باپ کا تحفظ بھی کامن روم کی ملازمت سے قبل کبھی بھی امامی کو عورت کی کمی کا احساس نہ ہوا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے اس خلا سے یکسر بے نیاز ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں کامن روم کی ملازمت سے اَن ہونی امیدیں بندھنے لگیں۔ وہ اپنے گرد اتنی بہت سی لڑکیوں کو دیکھتا تو اُسے تسکین ہوتی اور یقین رہتا کہ کبھی نہ کبھی کوئی ایسا واقعہ ضرور رونما ہو گا جو اُس کی زندگی میں بہار کے رنگ بھر دے گا۔ ان امیدوں اور کسی واقعہ کے مسلسل انتظار نے امامی کی سوئی ہوئی خواہش کو جیسے بھری نیند سے جگا دیا ہو۔ امامی اب سوتے جاگتے کامن روم کی لڑکیوں کے خواب دیکھنے لگا۔ وہ اپنے آپ سے کہتا ہر عورت کو ایک مرد کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ایک مرد ہے۔ یہ لڑکیاں ضرور اس پر توجہ دیں گی ضرور اس کے بارے میں سوچیں گی۔ لیکن جب دن پر دن، ہفتوں پر ہفتے اور مہینوں پر مہینے یوں ہی گذرتے چلے گئے اور اُس کی زندگی میں بہار کے رنگ بھرنے والا کوئی واقعہ پیش نہ آیا تو اُسے گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ اُس کے ذہن میں طرح طرح کی گرہیں پڑتی چلی گئیں اور جب شیریں نے بھی اُسے صرف پانچ روپے کا نوٹ دے کر ٹال دیا تو اسے احساس ہوا کہ اُس کی حیثیت کامن روم کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے، لکڑی کی الماری، ٹیبل ٹینس کی میز یا جھاڑن سے زیادہ نہیں ہے۔ اُسے مرد تو مرد کوئی جیتا جاگتا انسان بھی نہیں سمجھتا۔

اُس نے کئی بار چاہا کہ وہ اپنے دل کی بات سعیدہ افروز علی خاں سے کہہ دے اُس سے صاف کہہ دے کہ وہ اُسے پیار کرتا ہے اس کے دل میں اُسے چھو لینے اور چوم لینے کی خواہش انگڑائیاں لیتی رہتی ہے۔ آخر سعیدہ افروز علی خاں اُس کی بات کا کچھ نہ کچھ جواب تو دے گی بن مانگے کبھی کچھ نہیں ملتا مانگ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ناراض

ہو جائے گی اسے جھڑک دے گی۔ وہ پھر اپنا دست سوال ریحانہ کاظمی کے سامنے دراز کر دے گا۔صرف تھوڑی سی ہمت اور مناسب موقعہ کی ضرورت ہے۔ لیکن جب وہ شیریں سے دل کی بات کھل کر نہ کہہ سکا تو اسے اپنی بے بسی پر بہت رونا آیا۔ اس کا شیریں پر حق تھا۔شیریں اُس کی مقروض تھی اور پانچ روپے کا نوٹ اُس کی بھری نیند سے جاگی ہوئی شدید خواہش کو نہ سلا سکتا تھا۔ وہ اپنے کاندھے پر دیوانگی کی حد تک بڑھی ہوئی اس خواہش کی صلیب کو زیادہ دیر تک نہ اٹھا سکتا تھا۔ ہر لمحہ ٹیبل ٹینس کی میز کا احتجاج اُس کے کانوں میں گونجتا رہتا اور ننھے ننھے کبوتر اُس کے ذہن میں پھڑپھڑاتے رہتے۔ امامی کو اپنے آپ پر بے حد غصہ آیا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ وہ کسی سے اپنا قرض بھی وصول نہیں کر سکتا۔ وہ بڑبڑاتا رہتا۔

"میں کسی سے کچھ نہیں مانگ سکتا۔ میں اپنا حق بھی کسی سے نہیں لے سکتا۔ میں یونہی سلگتا رہوں گا۔ میں خواہش کی دھیمی دھیمی آنچ میں جلتا رہوں گا۔ میرے لیے اس کامن روم میں کچھ بھی نہیں ہے کہیں بھی کچھ نہیں ہے۔ میں ساری زندگی کھوتا رہوں گا کچھ پا نہیں سکتا۔"

سالانہ جلسہ ہو رہا تھا غیر معمولی چہل پہل تھی۔ لڑکے اور لڑکیاں دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ہر چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا۔ کامن روم بھی طرح طرح کی روشنیوں لباسوں اور خوشبوؤں سے پٹا پڑا تھا۔ لڑکیاں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے باتیں کر رہی تھیں، ہنس رہی تھیں اور اِترا رہی تھیں۔ لیکن امامی گم سم بیٹھا چہروں کو تکے جا رہا تھا۔ اُس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس کامن روم سے بہت سی لڑکیاں آج جا کر پھر کبھی نہ آئیں گی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔

اتنے بے شمار دن اُس نے اس کامن روم کے دروازے پر گذار دیئے۔ یہاں جانے کتنی لڑکیاں تنہا آئیں اور اپنے ساتھ چاہنے والوں کی ایک قطار لے گئیں۔ یہاں کتنے ہی لڑکے خالی ہاتھ آئے اور اپنے ساتھ لڑکیوں کا ایک گروہ لے گئے۔ یہاں ہر لڑکے

اور ہر لڑکی کو کوئی نہ کوئی چاہت کا تاج پہنانے والا ضرور مل گیا۔ لیکن اس کی پیاسی آتما پانی کی ایک بوند بھی نہ پا سکی۔ اُس کی بھوک خود اسے ہی کھاتی رہی۔ اب سعیدہ افروز علی خاں، ریحانہ کاظمی اور شیریں کے جانے کے بعد اسے ڈس لینے والی اجنبیت ہر لمحہ گھورتی رہے گی۔ ایک مستقل بیگانگی کامن روم کے درو دیوار سے اُتر کر اس کا مقدر بن جائے گی۔

اسٹیج پر ہر لمحہ بدلتی ہوئی روشنیاں سماں باندھ رہی تھیں کہ پس پردہ شیریں کے رقص کا اعلان ہوا۔ امامی خالی اسٹیج کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اچانک پورا اسٹیج تاریکی میں ڈوب گیا اور سرخ روشنی کے ہالے میں آہستہ آہستہ شیریں داخل ہوئی سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

شیریں نے پجارنوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ ایک ہاتھ میں پیتل کی تھالی میں ننھے ننھے دیے جل رہے تھے اور دوسرا بازو ہوا میں لہرا رہا تھا۔ بھری بھری پنڈلیاں طبلے کی تھاپ پر حرکت کرنے والے پاؤں کی ہر حرکت کے ساتھ رنگ بدلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ بازوؤں پر بندھی سفید موتیوں کی مالا اُس کی سرخی مائل جلد کے پس منظر میں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔ تنگ بلاؤز اس کی پسلیوں میں کھبا جا رہا تھا اور وہ رقص کر رہی تھی اس کے ماتھے کی شکنیں رقصاں تھیں، اس کے ابرو ناچ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ناچ رہی تھیں اُس کے بازو اس کی کلائی۔ اس کی انگلیاں محورقص تھیں، اُس کا انگ انگ رقصاں تھا، سارا ماحول سحرزدہ رقص کناں تھا۔ پس منظر میں مندر تھا۔ اسٹیج کے پیچھے پوجا کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور لڑکیاں گا رہی تھیں۔

ہری درشن کو آئی

میں آج

ہری درشن کو آئی

امامی کو ایسا لگا جیسے یہ وہ شیریں نہیں ہے جسے اُس نے ہمیشہ شلوار قمیض پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ کوئی اور لڑکی ہے جو ابھی ابھی روشنی کے سرخ ہالے میں آسمانوں سے اُتری ہے اور زمین پر صرف ہری درشن کے لئے آئی ہے اور ہری درشن کے بعد

پھر آسمانوں کی طرف لوٹ جائے گی۔ شیریں رقص کرتی رہی اور امامی پوری قوت سے آنکھیں پھاڑے، پلک جھپکائے بغیر شیریں کو دیکھتا رہا اور جب وہ رقص کرنے کرتے ہاتھ جوڑ کر آہستہ آہستہ اسٹیج سے نکل گئی تو امامی کو ایسا لگا جیسے اُس نے شیریں کو جی بھر کر نہیں دیکھا۔ رقص جلد ختم ہو گیا ہے۔ اسٹیج پر طرح طرح کے پروگرام ہوتے رہے لیکن امامی اپنے آپ سے سوال ہی کرتا رہا۔ کیا یہ وہی شیریں ہے جس کا راستہ اس نے روک لیا تھا کیا یہ وہی شیریں ہے جو کامن روم میں اسے دیکھ کر کاغذ کی طرح سفید ہو گئی تھی۔ کیا یہ وہی شیریں ہے جس نے اسے پانچ روپے کا نوٹ دیا تھا۔

ورائٹی شو ختم ہوتے ہی کامن روم میں ہنگامہ ہو گیا۔ شیریں کے سارے کپڑے غائب تھے۔ کامن روم کا کونہ کونہ تلاش کیا گیا مگر شیریں کے کپڑے نہ مل سکے اور اُسے اُسی لباس میں گھر جانا پڑا جو اس نے اسٹیج پر رقص کے لئے پہنا تھا۔

امامی اُس رات جب گھر پہنچا تو رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ اُس کی بغل میں شیریں کے گمشدہ کپڑوں کی پوٹلی دبی ہوئی تھی۔ بلکی صحن میں سو رہی تھی۔ اُس نے بلکی کو آہستہ آہستہ آوازیں دیں مگر بلکی سوتی ہی رہی۔

"وہ تو جیسے مری پڑی ہو۔ سوتی ہے تو جیسے مر جاتی ہو۔" امامی بڑبڑایا۔ گرمی کی رات بالکل سنسان اور ویران تھی۔ دور دور تک کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جھونپڑی کے اندر لالٹین جل رہی تھی جس کا شیشہ دھوئیں کی وجہ سے کالا ہو گیا تھا۔ لکڑی کے کرم خوردہ تخت پر اُس کا کھانا المونیم کی چھوٹی سی سینی سے ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ لیکن اُسے بھوک بالکل نہ تھی۔ اس نے المونیم کی سینی سے ڈھکا ہوا کھانا دیکھا اور سوتی ہوئی بلکی کی طرف دیکھا۔ کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا اور بلکی بے خبر سو رہی تھی۔

"بلکی" اُس نے پھر ہلکے سے بلکی کو آواز دی۔

"جیسے مردوں سے شرط لگا کر سوئی ہو۔ اس نے اپنے آپ سے کہا اور اطمینان سے جھونپڑی کے آخری سرے والی کوٹھری میں چلا گیا جس میں وہ سویا کرتا تھا۔ وہ اپنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اپنے سامنے شیریں کے کپڑے پھیلا لئے۔ شیریں کے مخصوص سینٹ کی

بو اس کے دماغ میں تیرتی چلی گئی۔ ساری جھونپڑی اُسی خوشبو میں بس گئی۔ اُسے ایسا لگا جیسے شیریں اُس کی جھونپڑی میں اس کے بستر پر اُس کے سامنے موجود ہے۔ اُس نے شیریں کی لوکٹ گلے کی قمیض اپنے سامنے بستر پہ بچھا دی اور اس پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ گہرے نیلے رنگ کی ریشمی قمیض جس سے شیریں کے پسینے اور سینٹ کی خوشبو آرہی تھی اس کے سامنے تھی اور وہ اس پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرے جارہا تھا۔ اس نے قمیض کے سائڈ بٹن چٹ چٹ کی آواز کے ساتھ کھولے اور زپ کئی بار جھر جھر کھینچی۔ باہر رات اب بھی بالکل ویران اور خاموش تھی۔

صبح کامن روم جاتے وقت امامی نے شیریں کے کپڑے احتیاط سے چھپا دیئے اب یہ کپڑوں کی پوٹلی ہی اُس کی تنہائی کی رفیق تھی۔ وہ ان کپڑوں کے لمس اور خوشبو میں جیتی جاگتی شیریں کو محسوس کرنے لگا تھا۔ جب تک یہ کپڑے اُس کے قبضے میں تھے شیریں اُس کے پاس تھی۔ امامی کامن روم پہنچا تو گذشتہ رات کی تقریب کا سارا کام بکھرا پڑا تھا۔ اُسے گئی رات تک فرصت نہ مل سکی اور کام کی مشغولیت میں نہ اُسے شیریں کا خیال آسکا اور نہ اُس کے کپڑوں کا۔ جب وہ کام سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ وہ گھر کی طرف چلا تو شیریں کے کپڑوں کی یاد سے اُس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔

جب امامی اپنی جھونپڑی کی گلی میں داخل ہوا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ گلی سنسان پڑی ہوئی تھی۔ آسمان پہ پورا چاند چمک رہا تھا اور گلی میں ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ گرمیوں کی چاندنی رات گلی میں، جھونپڑیوں پہ اور مکانوں کی چھتوں پر بچھی ہوئی تھی۔ اُس نے رسی سے بندھا ہوا دروازہ کھولا اور جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ دن بھر کے کام نے اُسے تھکا کر چور کر دیا تھا۔ اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا اور آنکھیں تکان سے بند ہوئی جارہی تھیں۔ جھونپڑی کے صحن میں ٹھنڈی پر سکون چاندنی کا نور تھا۔ رات کی مخصوص آوازیں تھیں۔ چاند نے صحن کا کونا کونا منور کر رکھا تھا۔ صحن کے عین وسط میں بچھی ہوئی چارپائی پہ بلکی شیریں کے گمشدہ کپڑے پہنے بے خبر سو رہی تھی۔ رات کی

مخصوص آوازوں میں اُس کی سانسوں کی آواز کا بوجھ بھی شامل تھا۔ ایسا لگتا تھا بلکی نے غسل کیا تھا، بالوں کا جوڑا بنایا تھا اور شیریں کا لباس پہن کر امامی کا انتظار کیا تھا اور اب جب امامی صحن میں اس کی چارپائی کے قریب کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا وہ بے خبر سو رہی تھی۔ شیریں کی قمیض کا کشادہ گلا بلکی کے لئے کچھ اور بھی کشادہ تھا۔ امامی نے پلنگ پر شیریں کا لباس پہنے بلکی کو دیکھا تو اس کی بوجھل آنکھیں ایک دم کھل گئیں، تکان کا احساس جاتا رہا اُس کے ذہن میں ننھے ننھے کبوتر پھڑپھڑانے لگے اور نگاہوں کے سامنے صرف شیریں کا لباس رہ گیا بلکی کہیں نہ تھی۔

شیریں نے پہلی بار خوشبو میں بسا ہوا ریشمی لباس پہنا تھا اور جاگتی آنکھوں پریوں اور شہزادیوں کے خواب دیکھے تھے اور خوشبو میں بسی ہواؤں میں اُڑتی جوانی کی گہری نیند سو رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں دلہن کے روپ بن بن کر بگڑ جاتے تھے ہاتھوں میں مہندی کے رنگ پھیلتے اور نئے نئے نقوش بن کر مٹ جاتے۔ وہ اڑن کھٹولے پر بلندی کی طرف پرواز کرتی پھر آہستہ آہستہ پستیوں کی طرف لوٹ جاتی۔ کانوں میں شادی کا گیت گونجتا پھر سناٹا پھیل جاتا۔ پھر دور سے آواز آتی۔

ویر میرا گھوڑی چڑھیا

ویر میرا

یہ کیسا گیت ہے۔ گیت کی لے ٹوٹ گئی۔ سر بکھر گئے۔ اُس کے ہاتھوں میں مہندی کا رنگ نہ تھا۔ اُس کا دلہن کا روپ نہ تھا۔ وہ اُڑن کھٹولے پر نہ تھی بلکہ اپنی پلنگ پر تھی جس کے پائے زمین میں دھنسے ہوئے تھے۔ اُس کا جسم چیر کر دو حصوں میں الگ کر دیا گیا تھا۔ اُس کے اندر خون کی گردش کے ساتھ لاوا بہہ رہا تھا۔ سب کچھ جل کر راکھ ہوتا جا رہا تھا اور اُس کے باپ کو اُس اذیت کا، کرب کا اور اس آگ کا کوئی احساس نہ تھا جو لمحہ لمحہ اُسے بھسم کئے دے رہی تھی۔ اُس نے پوری قوت سے چیخنا چاہا مگر اُس کے حلق سے کوئی آواز ہی نہ نکلی۔ بلکی نے امامی کو دیکھا، اُس کا چہرہ وہی تھا اور آنکھیں بھی وہی تھیں لیکن اُس کے خدوخال بدل چکے تھے، آنکھوں کا دیکھنے کا انداز بدل چکا

تھا۔ بلکی جسم کی اذیت جھیل رہی تھی لیکن روح کا کرب اُسے ناقابل برداشت محسوس ہوا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

بلکی جب ہوش میں آئی تو وہ اُسی طرح صحن میں پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے نقاہت سے گردن گھما کر اِدھر اُدھر امامی کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ اُسے کہیں نظر نہ آیا۔ اُس کے ہاتھ شل تھے اور پیر سُن ہو گئے تھے۔ اُسے آہستہ آہستہ جو کچھ اُس پر گذرا تھا دوبارہ یاد آیا۔ اسے خیال آیا کہ شاید اُس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔ لیکن اپنے لباس کی حالت دیکھ کر خواب کا گماں جاتا رہا۔ اُس نے دل میں سوچا کہ کاش یہ خواب ہی ہوتا۔ اُسے اپنے وجود پر، اس رات پر، جھونپڑی پر، تاروں پر، آسمان پر غرض کہ ہر شے پر اچانک تبدیلی کا گمان ہو رہا تھا۔ جیسے لمحہ بھر پہلے جو کچھ تھا لمحہ بھر بعد وہ نہیں ہے۔ جیسے وہ بلکی نہیں رہی، چاند وہ نہیں رہا۔ کوئی رشتہ اب کوئی رشتہ نہیں رہا۔

امامی بلکی کو چھوڑ کر جھونپڑی سے باہر نکل گیا اور شہر کی ویران سڑکوں پر تمام رات بے مقصد چلتا ہی رہا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کسی تاریک غار میں گر گیا ہو جہاں اندھیرے ہیں، مایوسیاں ہیں، پچھتاوے ہیں، ندامت ہے اور ڈس لینے والی تنہائی ہے ایک مستقل جان لیوا اکیلا پن ہے۔ وہ دنیا کے تمام رشتوں سے کٹ چکا ہے۔ اُس کا اس بھری پُری دنیا میں کوئی نہیں ہے اور وہ کسی کا [illegible]یں ہے اور سڑکوں کی دونوں جانب کھڑی ہوئی بلند اور بے جان عمارتیں انگشت بدنداں اُسے گھور رہی ہیں۔ سڑک کے موڑ پر اسے گرجا کی عمارت نظر آئی۔ چوٹی پر صلیب کا نشان نظر آیا۔ وہ گرجا کی عمارت سے کترا کر دوسری طرف مڑ گیا۔ اُس کے مڑتے ہی گرجا سے گھنٹوں کی آواز بلند ہوئی اُس نے اپنی رفتار تیز کر دی لیکن گرجا کے گھنٹے کی آواز مسلسل تعاقب کرتی رہی۔ وہ ایک پتلی سی گلی میں مڑ گیا۔ اچانک مندر سے ناقوس کی صدا بلند ہوئی اور گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ بھجن کے بول آہستہ آہستہ بلند ہونے لگے۔ گلی کے سرے پر مندر تھا جہاں اس کے قدم رک گئے۔

"پوجا ہو رہی ہے"۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ لوگ بیدار ہو کر رزق کی تلاش میں

نکلنے سے قبل عبادت گاہوں کی طرف جا رہے ہیں اپنے اپنے خداؤں کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔ اعتراف کرنے کے لئے پناہ مانگنے کے لئے بخشش کے لئے۔

وہ ایک طرف مڑ کر بھاگنے لگا۔ مندر بہت دور رہ گیا۔ بھجن کی آواز ختم ہو گئی پتلی گلی بہت پیچھے رہ گئی۔ اُس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ وہ سستانے کے لئے ایک دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

اُس نے آنکھیں موند لیں اور سر دیوار سے ٹکا کر سوچنے کے لئے حواس جمع کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ فجر کی اذاں بلند ہوئی۔ اُس کے اعصاب جھنجھنا گئے۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ مسجد کی دیوار کے سہارے کھڑا ہوا تھا۔ موذن اذان دے رہا تھا۔ لوگوں کو نیند سے بیدار ہو کر خدا کے حضور آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ مسجد سے دور ہونے لگا۔ اُس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ موذن کی صدا اُس کا تعاقب کرتی رہی۔

"اُس کا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ کس کی طرف جائے۔ اُسے کوئی خدا معاف نہ کر سکے گا۔ وہ سارے مادی اور روحانی رشتوں سے کٹ چکا ہے وہ دلدل میں گر گیا ہے۔ اس کے چاروں طرف حد نظر تک دلدل ہی دلدل ہے۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے کی طرف دھنستا جا رہا ہے۔ اُسے اس دلدل سے کوئی نہیں نکال سکتا۔ اُسے کوئی خدا معاف نہیں کر سکتا۔ توبہ کے سارے دروازے بند ہیں۔ سارے دروازے بند ہیں۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔" اُس نے سوچا۔ "ساری دنیا نے اپنے اپنے لئے اپنی پسند کے ان گنت خدا تخلیق کر لئے ہیں اور ان سے اپنے روحانی رشتے جوڑ لئے ہیں اپنے ہی تراشے ہوئے خداؤں کو عقیدت کے پھولوں سے سجا رکھا ہے اُن کے گرد فلسفوں کے حلقے تعمیر کر کے اُن کی حفاظت کی جا رہی ہے۔ الفاظ اور مباحث کی ڈھالوں سے آنے والے حملوں کو پسپا کیا جا رہا ہے۔ یہ سب وہم ہے۔ ساری دُنیا میں اجنبیت اور بے گانگی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ کوئی کسی کا آشنا نہیں ہے۔"

وہ تمام دن دیوانوں کی طرح سڑکوں پر پھرتا رہا۔ کام پر دم بھی نہیں گیا۔ گھر

لوٹ جانے کا حوصلہ نہ تھا۔ اسے کبھی رات کا حادثہ ایک خواب کی طرح لگتا اور کبھی اُس واقعہ کی ساری تفصیل ایک ایک کر کے اُس کی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی۔ کسی لمحے بلکی کا وجود صحن میں پلنگ پر پڑی ہوئی بدن دریدہ لاش کی طرح لگتا اور دوسرے لمحے صحن میں پلنگ پر مسلے ہوئے باسی پھول نظر آنے لگتے۔ وہ بے مقصد پھرتے پھرتے سمندر کے کنارے نکل گیا جہاں گہرے پانیوں میں شام کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ کشتیاں اپنے بادبان کھولے ساحل کی طرف لوٹ رہی تھیں۔ پرندے غول کے غول بسیروں کی طرف لوٹ رہے۔ سمندر کے پانی میں مچھلیوں اور سیپیوں کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

"میں دلدل میں پھنس گیا ہوں" وہ بڑبڑایا اور جو دلدل میں پھنس جائے اُسے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں نہیں مارنا چاہیئے کیوں کہ اس طرح وہ نیچے ہی نیچے دھنستا چلا جائے گا۔ بس اُسے چپ چاپ کسی مدد کا انتظار کرنا چاہیئے۔"

امامی جھونپڑی میں داخل ہوا تو وہاں اندھیرا تھا۔ لالٹین نہیں جلی تھی صحن میں چارپائی اُسی طرح پڑی ہوئی تھی اُسے بھی کسی نے نہ اٹھایا تھا۔ امامی کو چارپائی پر نہ بدن دریدہ لاش نظر آئی نہ مسلے ہوئے باسی پھول۔ بلکی کمرے کے اندر تاریکی میں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے اُسے آواز دی لیکن بلکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے قریب جا کر اسے آہستہ سے ہلا دیا۔ بلکی چپ چاپ پڑی رہی۔ اُس کے جسم پر وہی گہرے نیلے رنگ کی شیریں کی گمشدہ قمیض تھی جس سے شیریں کے پسینے اور سینٹ کی بو آ رہی تھی۔ امامی نے آہستہ آہستہ بلکی کے جسم پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا اُس کی آنکھیں سکڑ کر پھر تارا بن گئیں۔ بلکی کی آنکھ کھلی تو پھر وہ اذیت ناک مرحلے سے دو چار تھی۔

امامی نے لالٹین جلائی تو جھونپڑی میں روشنی پھیل گئی۔ وہ باورچی خانے میں گیا آگ روشن کی اور کھانا تیار کیا۔ اُسے بے حد بھوک لگ رہی تھی۔

بلکی پر دوسرا حادثہ پوری بیداری میں گذرا تھا۔ اُس نے امامی کا جھونپڑی میں داخل ہونا دیکھا تھا۔ پھر اُس کی آواز سنی تھی۔ وہ لالٹین کی زرد روشنی میں کمرے کی ہر چیز

کو بدلا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

"اللہ یہ ابو کو کیا ہو گیا۔ انہوں نے تو مجھے ماں کی طرح پالا تھا اور باپ کی طرح مجھے پروان چڑھایا تھا۔ وہ تو میرے باپ ہیں۔ مگر یہ سب کچھ کس طرح ہو گیا اب کیا ہو گا۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ دلدل میں گر گئی ہے۔

"بلکی کھانا کھالے۔ بھوکی رہے گی تو مر جائے گی۔" امامی کھانا لے کر اُس کے پاس آیا اور کھانا رکھ کر خود باورچی خانے میں کھانا کھانے چلا گیا۔ تمام دن کی بھوکی بلکی نے سر جھکا کر کھانا کھالیا۔

○

بہار کا گیت

کل ہی وہ چھ ماہ کی سزا کاٹ کر گاؤں لوٹا تھا۔

اُس نے کُندے پر پوری قوت سے کلہاڑی ماری۔

شہتوت اور جامن کے درختوں پر بہار کا پہلا گیت گونج رہا تھا۔

گاؤں کی خاموش سوگوار سی فضا میں کلہاڑی کی آواز اُسے بڑی اجنبی سی لگی جیسے کلہاڑی کا پھل کسی گوشت کے جسم میں گڑ گیا ہو۔ پدمنی کے قدموں کی آواز کلہاڑی کی آواز میں ایک لمحہ کے لئے ڈوبی لیکن دوسرے ہی لمحے پھر اُبھری اور اُس کے ذہن میں اُبھرتی ہی چلی گئی اور زیادہ واضح اور زیادہ صاف جیسے گہری نیند میں بھیانک خواب۔ پدمنی ہر لمحہ قدم قدم دور ہوتی چلی گئی لیکن اُس کے قدموں کی جانی پہچانی آواز اُس کے ذہن پر کلہاڑی کی آواز کی طرح مسلسل چوٹ لگاتی رہی۔ اُس نے فوراً کندے میں گڑی ہوئی کلہاڑی اوپر نیچے ہلا کر نکالی اور پے در پے ضربیں لگانے لگا۔ لیکن پدمنی جا چکی تھی۔ کندے سے پتلی پتلی چپلیاں نکل نکل کر ادھر اُدھر منتشر ہونے لگیں۔ اُس کے بازو کی

مچھلیاں پھڑکنے لگیں اور جب اسے یقین ہو گیا کہ پدمنی اب نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہو گی اور آخری موڑ مڑ گئی ہو گی تو اُس نے کلہاڑی ایک طرف پھینک دی۔ ڈرتے ڈرتے اُس طرف دیکھا جدھر پدمنی گئی تھی اُسے ڈر تھا کہ کہیں پدمنی کی گبر بنی اُس کے پاس ہی موجود نہ ہو۔ اُس کے پیچھے سہمی ہوئی مجسّم سوال بنی ہوئی بالپتی ورتا عورت کے روپ میں اُسے گھڑی گھور نہ رہی ہو اور اُس سے نظریں ملتے ہی طنز کا زہر میں بجھا ہوا تیر سن سے اُس کے سینے میں اُتار دے لیکن پدمنی تو جا چکی تھی۔ کلہاڑی کی مسلسل کھٹا کھٹ کے درمیان ڈوبتی اُبھرتی ہوئی آواز پدمنی ہی کے پیروں کی چاپ تھی۔ اُس نے ہی تو اُسے جانے کے لئے کہا تھا۔ اُس نے ایک بھرپور سانس لی اور کُندے پر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف کُندے سے اُڑی ہوئی چیلیاں بکھری ہوئی پڑی تھیں۔ اب یہ چیلیاں واپس اپنی جگہ پر نہیں جا سکتیں۔ اُس نے سوچا یہ چیلیاں ہمیشہ کے لئے الگ ہو گئیں۔ کٹے ہوئے کو اُن کٹے سے اور کٹے کو اُن کٹے سے نہیں بدلا جا سکتا۔ سمے کا دھارا کوئی نہیں موڑ سکتا۔ چاہے گھڑیوں کی بات ہو یا برسوں کی۔ ریت میں دبی ہوئی رنگ برنگی سیپیاں اندھیری راتوں میں چمکتے ہوئے جگنو اور برکھا کی بیر بہوٹیاں ہمیشہ سے اسی طرح ہیں مگر بچپن کے دنوں کی طرح کی چاد اب نہیں رہی اُن کی سندرتا اور روپ بالکل ویسے کے ویسے ہیں مگر اُس کے اپنے اندر سب کچھ بدل گیا ہے کھردرا پن اُس کے ہر جذبے کی کوملتا کو مٹا گیا۔ کل کی پدمنی آج کی پدمنی سے اور آج کی پدمنی آنے والی کل کی پدمنی سے روپ میں ایک ہوتے ہوئے بھی مختلف ہو گی۔ کُندے پر پڑے ہوئے کلہاڑی کے گھاؤ بھرے نہیں جا سکتے۔ اُسے کُندے سے ہری لکڑی کی ہلکی ہلکی باس اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ آس پاس گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے پھوس کی کٹیا میں اندھیرا آہستہ آہستہ دبے پاؤں رینگنے لگا تھا۔ باہر سے راجہ کی چارپائی کا ایک کونا اور اُس پر پڑی ہوئی میلی سی چادر کا ایک حصّہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا بیٹا راجہ بیمار تھا اور بخار سے پھُنک رہا تھا۔ اُس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ جھونپڑی کے اندر چلا جائے اور اپنے بیمار بیٹے راجہ کے پاس جا کر بیٹھ جائے اُسے ایسا محسوس

ہو رہا تھا جیسے پدمنی کو بھید بتانے کے بعد اب اُس کا اِس جھونپڑی سے کوئی تعلق نہ رہ گیا تھا۔ اُس کا راجہ سے بھی کوئی رشتہ نہ تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ لکڑی کے کرم خوردہ ڈیوٹ پر رکھے ہوئے مٹی کے دیئے میں تیل بھی نہیں ہے اور سارے بھانڈے ناج سے خالی ہیں اور جہاں راجہ لیٹا ہوا ہے وہاں موت کی کھکھراند، تپ کی گرمی اور اندھیرے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے سوائے اُس کالی بلی کے جو راجہ کے سرہانے سے ٹل کے ہی نہیں دیتی اور ہولے ہولے آواز نکالتی رہتی ہے جیسے بین کر رہی ہو۔

اُس کا ننھا راجہ بیمار ہے۔

شاید مر ہی جائے۔ اچانک اُس کے جی میں وسواس آیا۔

راجہ مر جائے گا۔

راجہ مر گیا ہے۔

اُس نے پھر کلہاڑی تولی اور کُندے پر ٹوٹ پڑا۔

کھٹ۔ کھٹ۔ چرخ چرر۔ کھٹ۔ چرر۔

گرم اور غبار آلود جھکڑوں کے بعد رات سے بارش کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ مرجھائے ہوئے درخت بارش میں نہلائے ہوئے نم ہواؤں سے ہولے ہولے جھوم رہے تھے دھوپ کی سختی سے بھنچی ہوئی زمین پر نظر آنے والی دراڑیں بارش کے پہلے ہی چھینٹے سے بند ہوگئی تھیں اور زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو کے بھپکے اُٹھ رہے تھے گاؤں کے کسان اپنے کھیتوں میں پہلا پھیرا ہل چلا رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر پانی کی ٹھنڈی ٹھنڈی بوندوں نے شفق کی سرخی مل دی تھی۔ اُن کے گلوں سے راگنی اُبل رہی تھی وہ گا رہے تھے اور ہل چلا رہے تھے ننھے ننھے خوبصورت پرندے اُن کے آگے پیچھے زمین پر اُتر آئے تھے اور ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ آس پاس اُگی ہوئی خودرو جھاڑیاں ٹہلتے ہوئے جھوم رہی تھیں۔

ہر چیز نکھری ہوئی تھی کھیتوں میں اور شہتوت اور جامن کے درختوں پر بہار کا پہلا گیت گونج رہا تھا۔

جب سورج آموں کے باغ کے پیچھے اُتر گیا تو مسجد کے مینار کے کلس پر سے پیلی دھوپ بھی غائب ہو گئی اور کھیتوں سے واپس لوٹتے ہوئے بیلوں کے گھنگھروؤں کی آواز باری باری سنائی دینے لگی تو اس نے پھر کلہاڑی ایک طرف پھینک دی اُس کے بازوؤں کی اُبھری مچھلیوں پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں اور جسم پر بہتے ہوئے پسینے سے آڑی ترچھی لکیریں سی بن گئی تھیں جیسے صبح صبح اروی کے چوڑے پتے پر شبنم گری ہوئی ہو۔ اُس کا سینہ لوہار کی دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا۔ کمزوری اُس پر غالب آگئی تھی۔ وہ تھک گیا تھا۔ اُس نے جھونپڑی کی طرف دیکھا وہاں ویرانی تھی، خاموشی تھی اور اندھیرا تھا۔ باہر ہر چیز نکھری ہوئی تھی جھینگر الاپنے لگے تھے اور درختوں کے ہرے کنچن رنگ سیاہ ہو گئے تھے جو اندھیرے میں مست ہاتھیوں کی طرح آہستہ آہستہ اپنی جگہ پر ڈول رہے تھے۔ وہ کندے پر بیٹھا خالی خالی نظروں سے کبھی تاریک جھونپڑی اور کبھی اُس راستے کو دیکھتا رہا جس پر کچھ دیر پہلے پدمنی گئی تھی۔

"پدمنی تو کیوں گئی"

"پدمنی تو چلی گئی"

اُس کے سینے پر گھونسا سا لگا اُس نے ہی تو پدمنی کو بھیجا تھا۔

"پدمنی تو استریوں کی سب سے شبھ جاتی ہے۔ اُسے تو دیویوں کا استھان دیا گیا ہے"، سوچتے سوچتے اُس کے دماغ کی رگیں پھول گئیں۔

اُس کے سامنے سے بینی داس کے مست بیلوں کی جوڑی جھومتی ہوئی گذری دن بھر کی چاپائی سے چور پسینہ میں شرابور سرشار بیلوں کی جھومتی ہوئی جوڑی گلے میں جھانجھ پڑی ہوئی سینگوں پر خول چڑھے ہوئے اُسے ایسا لگا جیسے اُس کے سینے پر وزنی سل رکھی ہوئی ہو۔ اس کا سینہ موم کی طرح نرم ہو گیا اور دھنسنے لگا۔ اُسے اپنے بیلوں کی جوڑی یاد آگئی۔ سرکاری کنوئیں کے ساتھ والا کھیت یاد آ گیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ اُس نے سوچا کاش وہ دن پھر لوٹ آئیں۔ اُس کا کھیت اُسے پھر مل جائے جس کی کوکھ سے وہ پھر ہرے ہرے پودوں کو جنم دے۔ اُس کے بیل اُسے پھر مل جائیں جن کے کاندھے پر ہل باندھ

کروہ پھر زمین کی مانگ میں سیندور بھر سکے۔ اُسے پھر پدمنی کا خیال آگیا۔ اُس نے کنکھیوں سے اُس طرف دیکھا جدھر پدمنی گئی تھی۔ پدمنی سے اُس کی پہلی ملاقات یاد آگئی فصل کٹ چکی تھی۔ وہ میلے سے لوٹ رہا تھا۔ راستے میں اُسے پیاس لگی۔ وہ مادھوپور کے کنویں پر تھیلے سے لوٹا اور ڈور نکال کر کنویں کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ جگت پر پدمنی کھڑی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں اور آبنوسی بدن والی پدمنی۔ اُسے ایسا لگا جیسے قریب ہی کرشن جی نے اپنی بنسری پر کوئی مدھرلے چھیڑ دی ہو۔

"پانی پیو گے" پدمنی بولی اور کرشن جی کی بنسری کی لے کے ساتھ گوپیوں کے گھنگھرو بجنے لگے۔"

"ہاں"

"کون جات ہو؟"

"مورائی"

"تو لو — میں تمہاری ہی جات والی ہوں"

اُس نے پدمنی کا بھرا ہوا لوٹا خالی کر دیا اور سوچنے لگا کہ سندرتا کی کوئی جات نہیں ہوتی۔

"اور"

"ہوں"

پدمنی نے لوٹا پھر کنویں میں ڈال دیا۔

"میلے سے لوٹے ہو؟"

"ہاں"

"کہاں جاؤ گے"

"جام نگر"

دوسرا لوٹا ناچتا ہوا کنویں سے باہر آیا اور خالی ہو گیا۔

"اور"

"ہاں"

"بہت پیاسے ہو"

وہ خاموشی سے پدمنی کا منہ تکتا رہا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا وہ اسی طرح بولتی رہے اور وہ اُسے دیکھتا رہے۔

"میں نے کہا بہت جور کی پیاس ہے"

"پہلے تو نہ تھی پر اب تیج ہو گئی ہے" اُس نے سچی بات بے دھڑک کہہ دی۔

پدمنی مسکرا دی اور اُسے ایسا لگا جیسے دیوالی کے دیپ جل اُٹھے ہوں اور کرشن جی کی بانسری کی لے تیز ہو گئی ہو۔

پانی پی لینے کے بعد اُسے خیال آیا کہ اُسے کچھ بات کرنی چاہئے۔ لیکن کیا بات کرے یہ اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔ دماغ میں کرشن جی کی بانسری کی لے نے الاؤ جلا رکھا تھا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے پدمنی نے اپنا خالی لوٹا بھرا اور رسی لپیٹ کر کنوئیں کی سیڑھیاں اُترنے لگی۔ اُس کے قریب سے گذرتے ہوئے پدمنی پھر مسکرائی۔

"اب جاؤ گے نہیں کیا"

"کس طرح جاؤں۔ پاؤں تو من من بھر کے ہو گئے ہیں"

"پھر بھی راستہ کیوں کھوٹا کرتے ہو۔"

اُس نے بھی اپنا لوٹا اور ڈوری اٹھالی۔

"جی چاہتا ہے یہیں رہ پڑوں"

"میرا نام پدمنی ہے سامنے میرا مکان ہے کبھی ادھر سے گذرو تو پانی یہیں پی لینا" اور پدمنی جواب کا انتظار کئے بغیر چلی گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے بانسری کی لے ٹوٹ گئی ہو راستے بھر اُس کو پدمنی کی بڑی بڑی آنکھیں، آبنوسی بال اور موتیوں جیسے دانت یاد آتے رہے۔ ہر پگڈنڈی کے موڑ پہ پدمنی جیسے اُس کے قدم روک لیتی۔ زندگی اتنی خوبصورت ہے اُسے پہلی بار احساس ہوا تھا۔ اُس کے قدموں کے نیچے پھیلی ہوئی پگڈنڈی سے حد درجہ شفیق تھی اور ہوا دل میں بے نام سی خوشبو سی بھر رہی تھی۔

کھیتوں سے لوٹنے والے بیلوں کی آواز رات کے اندھیروں میں گم ہوگئی تھی جھونپڑیوں میں چراغوں کی لو کانپنے لگی تھیں۔ اُپلوں کا دھواں چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ چوپالوں سے تازہ چارہ کترنے کی آوازیں آنے لگی تھیں اور جلتے ہوئے اُپلوں اور تازہ پکی ہوئی روٹیوں کی مہک سے اُسے اپنی جھونپڑی یاد آگئی لیکن اُس میں ہمت ہی نہ تھی کہ وہ اپنی جھونپڑی کے اندر چلا جائے۔ وہاں موت کا سناٹا تھا۔ اندھیرا تھا۔ بھانڈے ناج سے خالی تھے اور بلی بین کر رہی تھی۔

اُس نے سوچا اس کے جیل جانے سے قبل اُس کا راجہ کتنا تندرست اور ہنس مکھ تھا۔ مگر اس سمے وہ بیمار پڑا ہوا تھا اور پدمنی اُس کی ماں اس کے پاس نہیں تھی۔ اُس نے سوچا اس جھونپڑی میں یہ ویرانہ پن اور سناٹا کیسا ہے جیسے جھونپڑی سے زندگی نچوڑ لی گئی ہو جیسے اندر کوئی لاش پڑی ہوئی ہو راجہ تو صرف بیمار تھا پھر یہ موت کا سا بھیانک سکوت کیوں۔

"راجہ کہیں مر نہ گیا ہو۔"

"شاید راجہ مر گیا ہے۔"

"پدمنی بھی مر گئی ہے۔"

"اُس کی پدمنی ـــــ اُس کا راجہ"

اُس نے ایک طویل سانس لی اور ایسا لگا جیسے سانس کے ساتھ اُس کا دل باہر نکلا آرہا ہو۔

"پدمنی"

"پدمنی"

صبح ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ پھر ناڑی اور دوار

جب وہ مادھوپور سے پدمنی کو بیاہ کر لایا تو اُسے ایسا لگا جیسے وہ جے رام نگر میں پدمنی کے ساتھ داخل نہیں ہوا بلکہ رام سیتا کو لے کر لنکا سے لوٹے ہیں راون کو شکست ہوئی ہے اور لنکا فتح ہوا ہے۔ اُسے اپنی جھونپڑی اجودھیا کا محل معلوم ہوئی جھونپڑی

میں اُبٹن، صندل، سہاگ اور کنوارپن کی مہک بس گئی تھی۔ یہ خواب اور خوشبو اپنی لے بدلتی رہی کبھی ایسا لگتا جیسے مہندی مہک رہی ہو، کبھی یوں ہوتا کہ جھونپڑی میں عطر کی بسی ہوئی سانسیں مہکنے لگتیں۔ پھر یوں لگتا جیسے لال کپڑوں میں لپٹی ہوئی پدمنی پکے ہوئے پھوٹ کی طرح سوندھی سوندھی مہکنے لگی ہو۔ جیسے مہینوں کی تپتی ہوئی زمین پر بارش کا پہلا چھینٹا پڑ گیا ہو۔ سُر لے بدلتی ہوئی یہ خوشبو اُسے کسی نہ کسی عنوان ہمیشہ اپنے جلو میں لئے رہی۔ یہاں تک کہ اس رات بھی وہ خوشبو اُس کے ساتھ تھی جب وہ چوری کرتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ لیکن جب وہ جیل سے لوٹا تو خوشبو نہ تھی۔ اُس کی جھونپڑی سے وہ خوشبو جا چکی تھی اور اب اُسے جھونپڑی میں اس طرح محسوس ہوتا جیسے قریب ہی سے کوئی گندے پانی کی نالی گذر رہی ہو۔

اُس نے سوچا۔ کاش وہ دن پھر لوٹ سکتے۔ کتنے پیارے دن تھے کیا وہ دن لوٹ سکتے ہیں، کوئی اُس کی جھولی میں وہ دن پھر ڈال دے۔ اُس کا رواں رواں اس احساس کے ساتھ اذیت ناک درد سے چیخ اٹھا۔ انتہائی کرب سے اُس کا وجود لرز گیا لیکن اُس کی یہ چیخ کوئی نہ سن سکا۔ جیسے شاید اُس نے بھی کچھ سنا کچھ نہیں سنا۔

شادی کے ایک سال بعد راجہ پیدا ہوا۔ اُس کی حسین آبنوسی جسم والی پدمنی ماں بن گئی تھی۔ اُس کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ تخلیق کے عمل سے گذر کر پدمنی اُسے اور بھی خوبصورت لگنے لگی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں اعتماد کا نور آ گیا تھا۔ وہ پدمنی کو دیکھتا اور راجہ کو دیکھتا اور خوشی سے جھومنے لگتا۔ اُس کا خیال تھا کہ راجہ کے پیدا ہوتے ہی کوئی عجیب سی تبدیلی آگئی ہے۔ کوئی انہونی سی بات ہو گئی ہے یہ تبدیلی کیا تھی یہ انہونی سی بات کیا تھی اُسے معلوم نہ تھا البتہ اُسے یہ ضرور معلوم تھا کہ راجہ اُس کی سوچ میں شامل ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کا نام راجہ رکھا تھا اور وہ راجہ کو مستقبل میں سچ مچ راج کرتے دیکھا کرتا لیکن راجہ کی پیدائش کے کچھ دنوں بعد ہی کال پڑ گیا۔ کسانوں کی آنکھیں بادلوں کے انتظار میں پتھرا گئیں۔ بادل آئے بھی تو بن برسے ہی گذرتے رہے اور کسانوں کی آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو گئے لیکن بوند نہ برسی اور کال پڑ گیا۔ نمبردار کے کھیتوں کو کنویں سے پانی ملتا رہا مگر اُس میں اتنی شکتی کہاں کہ بادل سے برسے ہوئے پانی کی کمی کنویں سے پوری کر لیتا۔ اُس کے کھیت میں

پودے سر اُٹھاتے ہی جل گئے۔ اُس کے خون سے سینچا ہوا ایک ایک پودا آسمان کی طرف ایک ایک بوند پانی کے لئے دیکھتا رہا۔ وہ اپنے کھیت میں کومل پودوں کی پکار کو سمجھتا رہا اور جب پودے نڈھال ہو کر زمین سے لگ گئے تو وہ رو دیا اور کال پڑ گیا غلہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ لوگ شہروں کو بھاگنے لگے۔ اُس نے پہلے بیل اور پھر کھیت بیچ دیئے اور سارے پیسے ایک ایک کر کے پیٹ کے جہنم میں جھونک دئے مگر کال ختم نہ ہوا۔ گاؤں میں ایک دو گھر بھوک اور موت کے طوفان نے اُجاڑ دئے۔ نمبردار کے گودام سے غلے کی بوریاں اسمگل ہونے لگیں اور جب پیسے ختم ہونے لگے تو وہ آئندہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُس کا خیال تھا کہ کال کچھ دنوں میں ختم ہو جائے گا لیکن بڑھتا ہی گیا اور نمبردار کے گودام سے غلہ کی بوریوں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے گھروں سے بہو بیٹیاں بھی اسمگل ہونے لگیں اور ڈاک بنگلے سے لوٹنے والی بہو بیٹیوں کے گھروں میں چولہے روشن ہونے لگے۔ اُس نے یہ سب کچھ دیکھا اور کانپ کر رہ گیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے ڈاک بنگلے کے افسروں کے ہاتھ بہت طویل اور مضبوط ہیں اور اُن سے گاؤں کا کوئی گھر محفوظ نہیں ہے۔ اُس کی بدمنی بھی غیر محفوظ ہے، بھولی بدمنی۔ وہ بھی کسی رات چپکے سے ڈاک بنگلے پہنچ جائے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا اُس نے اپنے آپ ہی فیصلہ کیا۔ لیکن بھوک کا کیا علاج ہو۔ یہ بڑھتی ہوئی بھوک جو پیٹ سے پھیل کر انگ انگ میں رچ گئی ہے اس کا کیا اُپائے ہو گا۔

اور ایک رات وہ نمبردار کے گودام سے غلہ چراتا ہوا پکڑا گیا اور اُسے چھ ماہ کی سزا ہو گئی۔ اُسے چھ ماہ کے لئے سنگلاخ دیواروں میں محبوس کر دیا گیا اور کال پھیلتا ہی چلا گیا بڑھتا ہی چلا گیا۔

جیل اُس کے لئے بالکل نئی جگہ تھی لیکن کچھ دنوں بعد اُسے احساس ہوا کہ اُس کے لئے جیل میں اور جیل سے باہر کوئی فرق نہیں ہے بس یوں ہے کہ وہ ایک بہت بڑی جیل سے ایک بہت چھوٹی جیل میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ سخت مشقت، زیادتی اور ذلت یہاں بھی تھی اور وہاں بھی۔ صرف اُس کی نقل و حرکت کا دائرہ تنگ ہو گیا تھا اور اُسے

پدمنی اور راجہ سے جدا کر دیا گیا تھا۔ بس اسے تنہائی اور بے چارگی کا احساس ستاتا رہتا اور ہر لمحہ پدمنی کی مجبوریوں اور اُس سے فائدہ اُٹھانے والوں کا تصور اُسے بے چین رکھتا۔ جب وہ ضلع کی جیل سے رہا ہوا تو اُسے باہر کی فضا عجیب سی لگی۔ اجنبی سی جیسے اس سے پہلے اُس نے اتنی پھیلی ہوئی دنیا دیکھی ہی نہ ہو۔ لیکن جیل کے آہنی دروازے سے باہر نکل کر اُسے تنہائی کا احساس اور زیادہ شدت سے ہوا۔ ضلع کی جیل کے باہر وہ تنہا تھا۔ اُسے گاؤں سے لینے کے لئے جیل کے دروازے پر کوئی موجود نہ تھا اور گاؤں کا فاصلہ کافی تھا۔ گاؤں جہاں پدمنی اور راجہ تنہا تھے۔

جب وہ گاؤں کے قریب پہنچا تو رات کی تاریکی آہستہ آہستہ سمٹ رہی تھی اور دن کا اُجالا پھیل رہا تھا۔ اُس سے گاؤں بالکل قبرستان کی طرح ویران اور خاموش دکھائی دے رہا تھا۔ طویل مسافت سے تھکا ہوا اور گرد سے اٹا ہوا وہ کچھ اس طرح محسوس کر رہا تھا جیسے کسی مُردے کو اُس کی آخری منزل تک چھوڑ کر لوٹ رہا ہو۔ اُسے سرخ پتھروں والی ڈاک بنگلہ کی عمارت نظر آئی تو اُس کا دل نفرت سے اُمنڈنے لگا۔ اُس نے ایک موٹی سی گالی دی۔ اُسے اپنے قید ہونے سے پہلے کی کیفیت یاد آئی۔ بھوکی لڑکیاں یاد آئیں۔ اُن کے گھروں کے بوجھتے روشن چولہے یاد آئے۔

"بھوک پاپ اور پُن کا وچار ختم کر دیتی ہے"۔ اُس نے بلند آواز سے کہا جیسے اُس کے ساتھ ساتھ پگڈنڈی پر کوئی اور بھی چل رہا ہو۔

"بھوکی آتما کیا سوچ سکتی ہے۔ خالی پیٹ کے لئے روٹی کا اُپائے تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ گاؤں کی بیٹیوں کے پاس سندرتا اور کومل بدن کے سوا اور ہے بھی کیا۔ جسے دے کر وہ اپنا اور اوروں کا پیٹ بھر سکیں سو بہوویں بیٹیاں کما کر اپنوں کا پیٹ بھرنے پر مجبور ہیں۔ اُس کی پدمنی بھی بھوکی ہوگی۔ راجہ بھی بھوکا ہوگا۔ اُن کی بھوک کا کس نے اُپائے کیا ہوگا۔ اُن کا کون تھا۔ پدمنی مر جائے گی مگر ایسا نہ کرے گی پدمنی تو پوترتا کا دوسرا نام ہے۔ پدمنی تو استریوں کی سب سے شُبھ جاتی ہے۔ وہ تو پتی ورتا ہوتی ہے"۔

وہ ڈاک بنگلہ سے ابھی دور ہی تھا کہ سرخ پتھروں والی عمارت کے آہنی گیٹ سے تین

سائے دبے پاؤں باہر نکلے ۔ یہ تینوں عورتیں تھیں ۔ اُس نے سوچا ابھی بہوؤں اور بیٹیوں کا مول لگ رہا ہے ۔ ابھی گاؤں میں بھوک اُگی ہوئی ہے لیکن اُس کا ذہن ایک دم جھنجھنا گیا۔ ذہن میں ڈاک بنگلے سے نکلنے والی تین عورتوں میں سے ایک عورت نقطہ کی طرح سمٹ گئی اور آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوئی اور پھیلتے پھیلتے پدمنی بن گئی۔ چھ ماہ کی جدائی کے باوجود وہ پدمنی کو دور ہی سے پہچان سکتا تھا۔ وہی چال جسے اُس نے کنوئیں کی سیڑھیوں سے اُتر کر گھر کی طرف جاتے دیکھا تھا اور اُس کے ذہن میں نقش ہو گئی تھی۔

"اب جاؤ گے نہیں کیا؟" پدمنی نے کہا تھا۔

"میرا نام پدمنی ہے سامنے میرا مکان ہے کبھی اِدھر سے گزر ہو تو پانی یہیں پی لینا۔"
اُس چال کو وہ کیسے بھول سکتا تھا جس میں گوپیوں کے گھنگھروؤں کا سر گم تھا۔

وہی انداز۔

"بہت جور کی پیاس ہے"۔ اُس نے پوچھا تھا۔

"پہلے تو نہ تھی پر اب تیج ہو گئی ہے"۔ اُس نے جواب دیا تھا اور پدمنی مسکرا دی تھی۔
جیسے دیوالی کے دیپ جل رہے ہوں۔

وہی آبنوسی جسم۔

جیسے رام سیتا کو لے کر لنکا سے لوٹے ہوں جب اُس کی جھونپڑی اُسے اجودھیا کا محل لگنے لگی تھی۔ جب آس پاس صندل، مہندی اور سہاگ کی باس پھیل گئی تھی۔

پدمنی ڈاک بنگلے سے نکل کر گھر کی طرف چل دی۔

جب وہ پدمنی کے پیچھے پیچھے گھر پہنچا تو وہ راجہ پر جھکی ہوئی تھی اور راجہ بیمار تھا اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ پدمنی جو ممتا کا نور لئے کھڑی ہے رات ڈاک بنگلہ میں گذار کر آئی ہے لیکن جب پدمنی سے اُس کی آنکھیں ملیں تو اُس کا خون کھول گیا۔

"رات کہاں گئی تھی؟" اُس نے پدمنی سے سوال کیا۔

پدمنی کچھ نہ بولی۔

"میں پوچھتا ہوں رات کہاں گزاری؟"

"تم آگئے" پدمنی نے پوچھا۔
"کمینی، کتیا، چھنال" اور اُس نے پدمنی پر لاتوں اور گھونسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ بال پکڑ کر جھونپڑی میں گھسیٹتا پھرا۔ راجہ ریں ریں کرنے لگا مگر جب وہ بالوں سے گھسیٹنا بند کرتا تو لاتوں اور گھونسوں کی بارش شروع کر دیتا حتیٰ کہ اُس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔
"میں تو تجھے پدمنی ہی جانتا تھا لیکن تو تو کتیا نکلی"۔
وہ پدمنی کو زمین پر پڑا ہوا چھوڑ کر بولا۔ پدمنی زمین پر پڑی سسکیاں لیتی رہی۔ اُس کی ساڑھی چیتھڑا ہو چکی تھی اور وہ تقریباً نیم برہنہ پڑی ہوئی تھی۔ پلنگ پر راجہ پڑا ہوا رو ئے جا رہا تھا۔ اُس کے سرہانے پدمنی کے لائے ہوئے نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ اُس نے ایک نوٹ اُٹھایا اور تیزی سے جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ پدمنی جہاں پڑی ہوئی تھی وہیں سے اُسے تاڑی خانے کی طرف جاتے ہوئے چپ چاپ دیکھتی رہی۔
دوبارہ جب وہ جھونپڑی میں داخل ہوا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ پدمنی راجہ کے پاس بیٹھی ہوئی اُس کے سینے پر لیپ مل رہی تھی اور دوا کی بو جھونپڑی میں پھیلی ہوئی تھی۔
"میں پوچھتا ہوں رات ڈاک بنگلے میں کیوں گئی تھی"۔ اُس کی آواز کے ساتھ ہی تاڑی کا بھبکا جھونپڑی میں پھیلی ہوئی دوا کی بو میں شامل ہو گیا۔
"کتیا میں تجھے مار ڈالوں گا"۔
وہ پھر پدمنی پر ٹوٹ پڑا۔ نشے میں اُسے کوئی احساس نہ تھا کہ وہ کسی انسانی جسم کو اذیت دے رہا ہے۔ اُس کا اٹھا ہوا ہاتھ پوری قوت سے پدمنی کے جسم کے مختلف حصّوں کو پیٹتا رہا۔ اُس کی لاتیں پدمنی پر جانور کی طرح برستی رہیں۔ اُس نے پدمنی کی ساڑی کی دھجیاں اڑا دیں اور برہنہ جسم پر ناخنوں سے خراشیں ڈال دیں۔ پدمنی کے سینے پر، چہرے پر، پیٹ پر اور کولہوں پر نیلگوں نشان اُبھر آئے۔ جب تک وہ خود نہ تھک گیا اور نشہ اُس پر غالب نہ آگیا وہ مسلسل پدمنی کو پیٹتا رہا اور پدمنی مادر زاد برہنہ خاموشی سے پٹتی رہی۔ اُس نے زبان سے شکوہ تو کیا حلق سے درد میں ڈوبی ہوئی کراہ تک نہ نکالی۔ جیسے اُس کا جسم پتھر کا ہو اور کسی اَن دیکھی طاقت نے اُس کے مدافعت

کے لئے اُٹھنے والے ہاتھوں کی قوت سلب کرلی ہو اور گویائی چھین لی ہو۔صرف اُس کی آنکھوں میں زندگی کی بھرپور چمک تھی۔جس میں اعتماد تھا۔پیار تھا اور ان مٹ سچائی اور گیان تھا۔

وہ تھک کر چارپائی پر بے سدھ گر گیا۔

"پدمنی۔میں جسے پتی ورتا اور پوتر جانتا تھا۔وہ عورت جاتی پر کلنک کا ٹیکہ نکلی۔ تو اس گھر سے چلی جا۔"

"یہاں سے چلی جا۔"

"اجودھیا کے محل میں کلنکنی نہیں رہے گی۔"

"دور ہو جا"

وہ بڑبڑاتے بڑبڑاتے سو گیا اور خراٹے لینے لگا۔پدمنی راجہ کے سینے پر بچا ہوا لیپ ملنے لگی۔شاید اُسے احساس نہ تھا کہ اُس کے جسم پر ایک دھجی بھی نہیں

صبح اُس کی آنکھ کھلی تو اُسے سخت بھوک لگ رہی تھی اور پنڈا پھنک رہا تھا طویل سفر، بھول، جوش اور خالی پیٹ تاڑی نے اُس کا سارا وجود پھونک دیا تھا۔اب وہ راکھ اور ریت کے ڈھیر سے زیادہ کچھ نہ رہ گیا تھا۔رات بارش ہونے کی وجہ سے فضا میں تازگی اور نکھار تھا اُس نے پدمنی کی طرف دیکھا وہ سر جھکائے راجہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔اُسے ایسا لگا جیسے آج پھر پدمنی کے جسم سے سہاگ اور کنوارپن کی خوشبو پھوٹ رہی ہو۔

"کھانے کو ہے کچھ"

پدمنی منہ سے تو کچھ نہ بولی ایک تھالی میں اُبلے ہوئے چاول لے آئی۔کھانے کے بعد اُس نے پھر پدمنی کی طرف ندامت سے دیکھا۔اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر ہلکے ہلکے نیلگوں نشان گہرے پانی میں کائی کی طرح تیر رہے تھے۔اُس نے آہستہ سے آواز دی۔

"پدمنی"

پدمنی نے اُس کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں اور اُسے کنوئیں پر لوٹے سے پانی

پلاتی ہوئی ایک اجنبی لڑکی یاد آ گئی۔

"بہت جور کی پیاس ہے۔"

"پہلے تو نہ تھی پر اب تیج ہو گئی ہے۔"

اُسے پدمنی پر سمندروں کی گہرائی جتنا پیار آ گیا۔

"پدمنی میرے پاس آ"

پدمنی اُس کے قریب چلی گئی۔ اُس نے پدمنی کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اُس کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور کسی بے آب و گیاہ، گرم تپتے ہوئے پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر پتھر کی سب سے بڑی سیاہی مائل چٹان پگھل گئی وہ رونے لگا۔ پدمنی رونے لگی۔ دیر تک دونوں روتے رہے اور ایک دوسرے کو چومتے رہے حتیٰ کہ اُس کے دل کا غبار دھل گیا اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے پدمنی آج ہی بیاہ کر آئی ہے۔ اُس کے چہرے پر راجکمار سدھارتھ جی کے سمان شانتی آ گئی۔

باہر رات کی بارش نے پیڑوں کو نہلا دیا تھا۔ کھیتوں اور شہتوت اور جامن کے درختوں پر بہار کا پہلا گیت گونج رہا تھا۔

"راجہ کے لیپ لگا دے" مہاتما بدھ کی مورتی بول پڑی۔

"لیپ کھتم ہو گئی" راجکماری سیتا جی نے کہا۔

اجودھیا کا محل مسمار ہو گیا اور اُس کے سامنے کال کا نقشہ کھنچ گیا اور مہاتما بدھ جی پر گیان کی پہلی جوت جاگ اٹھی۔ گیا میں برگد کا درخت بولنے لگا۔ اُس نے سوچا اب کیا ہو گا۔

"میں ابھی دید جی کے پاس جاتا ہوں۔ وہ جرور لیپ اُدھار دے دیں گے۔" اور وہ دید جی کی طرف چل دیا۔

دید جی اپنی کوٹھڑی میں بیٹھے تیل کے دیئے کی لو بڑھائے رامائن الاپ رہے تھے۔ کوٹھڑی میں جلتے ہوئے دیئے کے دھوئیں اور تیل کی بو ہلکی ہلکی محسوس ہو رہی تھی۔ اندر کوٹھڑی میں حبس تھا۔ دید جی نے الاپ روک کر اُسے دیکھا۔

"کیا ہے؟"

"دیدجی مجھے راجہ کے لئے لیپ چاہیئے۔"

"ایک روپیہ نکالو۔"

"دیدجی ابھی تو پیسے نہیں ہیں۔ کچھ دنوں میں پائی پائی چکا دوں گا۔"

"اب اُدھار کا جمانا نہیں ہے۔"

"دیدجی راجہ مر جائے گا۔"

"تو میں کیا کروں، مرنے دے۔ کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ ایک آدھ روز ہی سدھار جاویں ہیں۔"

"دیدجی دیا کرو۔ میرا راجہ۔"

"اب تیرے پاس پیسوں کی کیا کمی ہے۔ کہیں چوری کر لے نہیں تو ڈاک بنگلے کی کمائی نکال۔ تین روپے سے لے کر پانچ روپے دیویں ہیں ایک رات کے۔ مال مال کی بات ہے۔"

سن سے دیدجی کا تیر اُس کے سینے میں کھُب گیا۔ چوٹ بڑی بھرپور تھی۔ پہلے تو اُس کے جی میں آئی کی دیدجی کا بھیجا نکال دے لیکن کچھ سوچ کر تلملا کر رہ گیا۔

گاؤں میں دو ایک جگہ جہاں سے پیسے ملنے کی اُمید تھی کوشش کی لیکن اُسے کسی طرح کچھ نہ مل سکا۔ وہ مایوسی کے عالم میں اپنی جھونپڑی میں داخل ہوا۔ راجہ بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ پدمنی نے کھانے کے لئے پوچھا تو اُس نے انکار کر دیا۔ پیٹ کی بھوک انگ انگ میں پھیلتی جا رہی تھی لیکن اب اُس میں چوری کرنے کی ہمت نہ تھی۔ دوبارہ جیل جانا اُس کے بس کی بات نہ تھی اور دوبارہ پدمنی اور راجہ سے دوری اُسے کسی طرح منظور نہ تھی۔ جیانک پھر پدمنی کے بدن کی مہک غائب ہو گئی۔ اُس نے سوچا وہ خوشبو کہاں چلی گئی۔ اب کرشن جی کی بانسری کی لے کیوں نہیں سنائی دیتی۔ پدمنی کے آبنوسی جسم میں کشش کیوں نہیں رہی۔

رات بارش ہوئی تھی۔ کسان اپنے اپنے کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے۔ پانی کی بوندوں نے اُن کے چہروں پر شفق کی سرخی مل دی تھی۔ اور کھیتوں اور درختوں پر بہار کا گیت گونج رہا تھا۔ لیکن اُس کا کھیت نہ تھا۔ اُس کے بیل نہ تھے۔ راجہ بیمار تھا اور پیٹ کی بھوک انگ انگ میں بس گئی تھی اور سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ اُس نے بے خیالی

بن کونے میں رکھی ہوئی کلہاڑی ہاتھوں میں تو لی۔ دھار انگلیوں سے پرکھی اور کلہاڑی اُسی جگہ پر رکھ کر جھونپڑی میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"پدمنی" اُس نے انتہائی نرم لہجے میں پدمنی کو آواز دی۔

پدمنی اُس کے قریب آ گئی۔

"پدمنی کوئی صاف سی اچھی سی ساری پہن لے۔" اُس نے کہا۔

پدمنی اُس کا منہ دیکھنے لگی۔

"کیوں"

"میں جس طرح کہتا ہوں ویسے کرنا۔"

پدمنی شرما گئی۔

"گھر میں کھانے کو نہیں اور تم ——"

"زبان کیوں چلاتی ہے۔" وہ پدمنی کی بات کاٹ کر بولا۔

پدمنی نے ایک صاف ستھری ساری پہن لی۔

"بالوں میں تیل ڈال لے اور کاجل بھی لگا لے۔"

پدمنی نے پھر احتجاج کرنا چاہا مگر اُس کا پتھر چہرہ دیکھ کر چپ ہو گئی۔ اُس نے سوکھے جھنڈ سے بالوں میں پانی ڈال کر کنگھی کر لی اور آنکھوں میں کاجل کی لکیر قسمت کے فیصلے کی طرح کھینچ لی۔

اُس نے سوچا

"پدمنی کا دوسرا نام سندرتا ہے۔"

سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا جھونپڑی کے اندر دبے پاؤں داخل ہو رہا تھا۔ اُس نے کلہاڑی اٹھائی اور اُس کی دھار انگوٹھے سے پرکھتا ہوا بولا۔

"دیکھ پدمنی واپسی میں راجہ کے لئے دوا اور میرے لئے ایک ادّھا تاڑی ضرور لانا اور صبح ذرا جلدی آ جانا۔"

پدمنی حیران ہو گئی۔

"میں کہاں جاؤں۔ اور میرے پاس تو ایک دھیلا بھی نہیں۔ پھر دوا کیسے لاؤں گی؟" اس نے پدمنی کو بازو سے پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ جھونپڑی کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

"پدمنی دھیرے بول" اس نے چپکے سے اس طرح کہا جیسے کوئی سازش کر رہا ہو۔

"تو آج بھی رہا۔ کل بھی جانا۔ روج ہی ڈاک بنگلہ چلی جایا کر اور واپسی پر سویرے راجہ کے لئے لیپ اور میرے لئے تاڑی لے آیا کر۔ جا جلدی کر رات ہو گئی ہے۔ دیر ہو گئی تو مانگ ختم ہو جائے گی۔"

اس نے آہستہ سے پدمنی کو جھونپڑی کے باہر ڈھکیل دیا اور تیز تیز قدموں سے کنڈے کے پاس جا کر کلہاڑی تولی اور کنڈے پر مار دی۔ کلہاڑی کی آواز میں جاتی ہوئی پدمنی کے پیروں کی چاپ ایک لمحہ کے لئے دب گئی۔ پدمنی چھوٹے چھوٹے پر اعتماد قدموں سے اس پگڈنڈی پر ہو لی جو ڈاک بنگلہ کی طرف جاتی تھی۔

○

ایسا بھی ممکن ہے کیا۔ کہیں ایسا بھی ہوتا ہے۔ لوگ اُس
طرح بھی اپنے گھروں سے بے گھر ہوتے ہیں یہاں اُس کی اپنی
زمین ہے جس کی خوشبو میں وہ پیدا ہوئی ہے جس پر گھروندے
بناتے، بگاڑتے وہ جوان ہوئی ہے۔ یہاں اس کا اپنا گھر ہے
جہاں اس کے اجداد سالہاسال سے پیدا ہوتے اور مرتے رہے
یہاں وہ مسجد ہے جس کے مکتب میں اس نے قرآن پڑھا ہے۔ ایسا
کسی طرح ممکن نہیں، اس طرح کسی کا گاؤں، کسی کا گھر چھِنا ہے
جو اس کا چھن جائے گا۔ یہاں سے جب بھی کوئی گیا ہے، اپنے
نقشِ قدم تلاش کرتا ہوا ضرور لوٹا ہے۔ پھر وہ کس طرح جا رہی
ہے۔ وہ اپنے نقشِ قدم کہاں تلاش کرے گی، وہ ایسا نہ ہونے
دے گی۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر کس زمین پر اس کے قدم جم سکیں گے
کس گھر کو وہ اپنا گھر کہہ سکے گی۔

——— بدن کا طواف

بدن کا طواف

سگریٹ کا گُل ایش ٹرے سے پھسل کر میز پر گرا اور پنکھے کی ہلکی ہوا سے لڑھک کر عنابی قالین پر پھیل گیا اور تب اُسے راکھ کے اس طرح گم ہو جانے کا احساس ہونے لگا بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ سلگ رہی تھی اور اُس کا آخری بادامی سرا لپ اسٹک سے سرخ ہو گیا تھا۔ سلگتی ہوئی سگریٹ کی تپش انگلیوں پر محسوس ہو رہی تھی، لیکن وہ اپنے خیالات میں گم تھی اور اتنا ہوش بھی نہ تھا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر سگریٹ ایش ٹرے میں مَسل دے۔ وہ بہت زیادہ تھکی ہوئی افسردہ اور مایوس دکھائی دے رہی تھی۔

منیرہ کی لانبی خوبصورت انگلیوں میں سگریٹ سلگتی رہی۔

ڈاکٹر صوفے میں بے جان سا ڈھیر تھا اور سگریٹ کے دھویں سے ہونٹوں کی گولائی کی مدد سے دائرے بنا کر اُن کو ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

کمرے میں ذہنوں کی کشیدگی محسوس ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر نے دھوئیں کے دائروں کو ہوا میں غائب ہوتے ہوئے دیکھ کر سوچا وہ اب منیرہ

سے تھک چکا ہے۔ یہ بات آخر یہ بے وقوف لڑکی کیوں نہیں محسوس کرتی محض فضول اور سنجیدہ باتیں کیے جا رہی ہے۔

"تم یہ کیوں نہیں سمجھتے" منیرہ نے دھیمے دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ "تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں LIVING TOGETHER ٹائپ نہیں ہوں۔ آخر ہم یہ گناہ آلود زندگی کب تک گزارتے رہیں گے۔ کیا کسی وقت تمہارا CONSIOUS تم سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ یہ وعدوں پر وعدے، آج اور کل، ابھی نہیں بعد میں یہ سب کیا ہے۔ محبت ایک مقدس جذبہ ہے اور شادی ایک مقدس رشتہ۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے میں جانتی ہوں۔ مجھے اس کا یقین ہے۔ لیکن میں اپنا گھر، اپنے بچے اور اپنا شوہر چاہتی ہوں I WANT TO POSSESS THEM۔ میں تمہارے بچوں کی ماں کہلانا چاہتی ہوں۔ ذرا سوچو ڈاکٹر HOW EXCITING۔"

منیرہ کی نان اسٹاپ تقریر سے وہ ذرہ برابر بھی متاثر نہ ہو سکا۔ وہ اب بیزار ہو چکا تھا۔ دائرے ہوا میں تحلیل ہو رہے تھے۔

"ہش — یہ کس قدر احمقانہ خیال ہے۔ منیرہ۔ میری بیوی ——

HOW STRANGE —— ہش۔" ڈاکٹر اختر نے سوچا۔

ہوا میں تحلیل ہوتے ہوئے دھوئیں کے دائرے اور اختر کی خاموشی اس کی تقریر کا IMPACT ضائع کئے دے رہی تھی۔ اُس کی انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ کانپنے لگی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ آخر اُس کا ہاتھ اس طرح کیوں کانپ رہا ہے۔ میں شاید نروس ہوں۔ شاید یہ احساسِ شکست ہے۔ وہ کیوں بے سبب نروس ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کمزوری کیوں ہے اُسے اپنے آپ پر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ ایسی بودی تو کبھی نہ تھی۔ پھر یہ اُس کا ہاتھ کیوں لرز رہا ہے۔ اُسے خیال آیا کہ شاید بڑھاپا اُسے آہی لینے والا ہے۔ شاید اُس کی عمر پینتیس ۳۵ سال ہو گئی ہو گی یا شاید چالیس سال ہو گئی ہو یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہو، اُسے اپنے بالوں کی وہ سفید لٹ یاد آگئی جو وہ کنگھا کرتے ہوئے بڑی چابکدستی سے کالے بالوں کے

نیچے چھپا دیا کرتی تھی۔ وہ اب بوڑھی ہوگئی ہے۔ جوانی کتنے کم عرصے رہتی ہے۔ یہ تو صرف خود فریبی ہے۔ ورنہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان خوابوں کے چند خوبصورت لمحے ہی جوانی کی عمر ہے اور وہ لمحے اُس کی زندگی میں دبے پاؤں آئے اور چوروں کی طرح چپ چاپ گھر خالی کر گئے۔ اب تو اس کے جسم پر نیلی نیلی نسیں اور زیادہ نمایاں ہوتی جارہی تھیں۔ اُس نے سگریٹ آخر کار بے دلی سے ایش ٹرے میں مَسل دی اور مٹھیاں بند کرکے دونوں ہاتھ گھٹنوں میں دبا لیئے۔ مبادا ڈاکٹر اختر ان کانپتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر اُس کے جذبات کا اندازہ لگالے۔

"منیرہ تم آج حد سے زیادہ سنجیدہ اور جذباتی ہوگئی ہو" ڈاکٹر اختر نے کہا منیرہ نے ڈاکٹر اختر کی طرف تنقیدی نظروں سے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں اپنے سوال کا صاف اور سچا جواب تلاش کرنے لگی۔ مگر وہاں اُسے کچھ نہ مِلا پھر اس نے ڈاکٹر اختر کی شخصیت کا جائزہ لیا۔ اور اُسے اپنے شوہر کی حیثیت سے دیکھنا چاہا۔

"ایک ہی شخص کبھی کچھ اور کبھی کچھ نظر آتا ہے۔ کسی سے وہ مخصوص حالات میں کسی طرح پیش آتا ہے۔ کسی اور سے عین انھیں حالات میں بالکل مختلف انداز میں پیش آتا ہے۔ کبھی وہ فرشتہ نظر آتا ہے کبھی وہی شخص شیطان ہوجاتا ہے۔ کبھی اُس کا دل موم کی طرح نرم ہوتا ہے کبھی وہ ظالم بن جاتا ہے۔ ایک آدمی کے اَن گنت روپ ہیں اور سب ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں"۔ منیرہ سوچتی رہی "یہ شادی کے وعدے۔ یہ شوہر۔ یہ ڈاکٹر اختر۔ یہ میں۔ سب کچھ جو کچھ اصل میں ہیں وہ نظر نہیں آتے یہ سب کسی منظم فراڈ کے اجزائے ترکیبی ہیں"۔

وہ ڈاکٹر اختر سے مخاطب ہوئی۔

"بولو ڈاکٹر۔ مجھے جواب دو۔ آج فیصلہ ہو ہی جانا چاہیئے۔ مجھے اب اس زندگی سے نفرت ہوگئی ہے۔ میں اب انتظار کی ایک ایک گھڑی سے انجانے میں آنے والے پتھروں کی طرح خائف رہتی ہوں جانے کب کس طرف سے وہ مہلک پتھر آہی جائے"۔

"جانے تم کس طرح کی باتیں کررہی ہو۔ ڈونٹ بی سلی" ڈاکٹر نے صوفے میں دھسے

دھنسے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"سچ اختر میں اور انتظار نہیں کر سکتی۔ مجھ سے آج اور ابھی ہاں کہو" منیرہ نے بچوں کی طرح ضد کی۔

"اچھا۔ اچھا۔ آج شام وارڈ میں۔ منیرہ میں تم سے وارڈ میں بات کروں گا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ آج ہی۔" ڈاکٹر نے اُسے بچوں ہی کی طرح تشفی دی۔

منیرہ وارڈ میں داخل ہوئی تو سامنے ہی بیڈ نمبر ۱۲ پر رات داخل ہونے والی لڑکی بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی منیرہ کا دل ڈوبنے لگا۔ جیسے کسی نے اس کے کان میں کہا۔

"یہاں کس قدر اذیتیں ہیں۔ لوگ کتنے دُکھی ہیں۔ کس قدر آزردہ ہیں۔ ہم خوشیاں مانگتے ہیں، مسرتوں کی تمنائیں کرتے ہیں لیکن ہمیشہ غم ہمیں بن بلائے بن مانگے آلیتا ہے۔ خوبصورتی کتنی ناپائیدار ہے۔ چیزیں اپنا حُسن کس قدر جلد کھو دیتی ہیں خوشی اور حُسن ہمارا مقصود ہے لیکن کتنا کمیاب ہے۔ دنیا کی لامحدود وسعتوں میں ہر طرف بدصورتی پھیلی ہوئی ہے۔ ہر طرف ٹوٹ پھوٹ ہے شکستگی اور مایوسی ہے اور خدا کی اس دنیا میں ہر لمحہ بدصورتی میں اضافہ ہو رہا ہے۔"

اُس نے بیمار لڑکی کی طرف دیکھا۔ کبھی اُس کے سیاہ چمکدار بال اُس کی پنڈلیوں تک جھولتے اور لہراتے رہتے تھے۔ اُس کے ملائم لانبے چمکدار بالوں کی ہر مرد نے تعریف کی تھی اور ہر لڑکی نے اُن بالوں پر رشک کیا تھا۔ وہ اِن بالوں کی دیکھ ریکھ سے تھک جاتی تھی چڑ جاتی تھی۔ اُس کے بازوؤں کی تنی ہوئی مچھلیوں پر جس کی نظریں پڑتیں وہیں جم جاتیں۔ بازوؤں پر منڈھی ہوئی بلاؤز کی آستینیں ایسا محسوس ہوتا جیسے دورانِ خون بند کئے دے رہی ہیں اور بلاؤز کی آستینوں کے ساتھ اُس کے بازوؤں کی گلابی جلد اور گلابی ہو جاتی اور خون چھلکنے سا لگتا۔ گلے میں پڑا ہوا گولڈن لاکٹ اُس کے چہرے کو شعلے کی طرح روشن کر دیتا۔ اب چہرے پر جیسے کسی نے راکھ مل دی ہو، بازوؤں کی مچھلیاں غائب ہو گئی تھیں اور کھال ہڈیوں سے الگ جھول رہی تھی اور بال تراش دیئے

گئے تھے اور سر پر گنج چھپانے کے لئے کالے رنگ کا رومال باندھ دیا گیا تھا۔ اُس کا حسن، اُس کی باتیں اور اُس کے جاندار قہقہے اب بھی ذہنوں میں تازہ ہوں گے۔ شاید اُن قہقہوں کی گونج اب بھی فضا میں موجود ہو۔ لیکن اس لمحے وہ ہسپتال کے بیڈ نمبر ۱۳ پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اُسے کچھ خبر نہیں کہ اُس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے کتنی آنکھیں اُس کے غم میں اشکبار ہوئیں کتنے انجانے لوگوں نے اُسے جانے بنا اُس کی زندگی کی دعائیں مانگیں۔ اُس کی حالت پر رحم کھایا۔ اُسے ان دعاؤں اور ہمدردیوں کا کوئی علم نہیں اب شاید وہ کبھی ہوش میں نہ آسکے وہ دوبارہ آنکھیں ہی نہ کھول سکے اور کسی سے ایک لفظ کہے بغیر ہمدردی، پیار و محبت کا ایک جملہ سُنے بغیر مر جائے۔

"اوہ خدا"

ڈاکٹر اختر کی پراسرار خاموشی اور لڑکی کی مسلسل بے ہوشی کی وجہ سے منیرہ کو شدید ڈپریشن ہونے لگی اُس کے دل پر مایوسیوں کی تہہ پر تہہ بیٹھتی چلی جا رہی تھی۔

"یہ تو سارے زندگی کے ڈھکوسلے ہیں۔ لڑکی مر جائے گی تو لوگ اُسے جلد سے جلد دفن کر دیں گے۔ کفن میں لپیٹ کر گلاب اور کافور میں بسا کر قبر میں اتار دیں گے۔ لڑکی کو نہ گلاب سے کوئی راحت ملے گی نہ کافور سے۔ اُسے دفن کر دیں۔ جلا دیں یا یونہی پڑا رہنے دیں اُسے کیا۔"

منیرہ نے اسٹاف روم سے باہر دیکھا۔ گیلری ویران پڑی ہوئی تھی۔ وارڈ میں خاموشی تھی۔ فی میل وارڈ میں ۱۳ نمبر پیشنٹ کے ساتھ والی خوبصورت لڑکی ابھی ابھی باتھ روم سے نکلی تھی اور اب بیچ پر بیٹھی ہوئی دوپٹے کے آنچل سے ہاتھ خشک کر رہی تھی۔ ڈیوٹی ڈاکٹر کے کمرے سے دروازے پر پڑے ہوئے بنفشئی رنگ کے پردے کے کنارں سے روشنی تیز دھار کی طرح گیلری کی تاریکی کو کاٹ رہی تھی۔ اندر سے ڈاکٹر اختر کے جونیئر کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آ رہی تھی جو نوجوان نرس جوزفین سے فلرٹ کر رہا تھا۔ چائے کی پیالیاں بج رہی تھیں اور نرس جوزفین بات بات پر ہنس رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ گیلری سے ہوتی ہوئی باہر لان کی طرف چلی گئی۔ اُس نے کمرے کے سامنے

سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ ڈاکٹر اختر کا جونیر کرسی پر نیم دراز تھا اور نرس جوزفین میز پر کہنیاں ٹکائے ڈاکٹر اختر کے جونیئر پر جھکی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اختر کمرے میں نہیں تھا۔ پرائیوٹ روم کا پیشنٹ کسی فلمی میگزین کے اوراق الٹ رہا تھا۔ کھڑکی سے صرف سینے پر ٹکا ہوا میگزین اور پیشنٹ کے دونوں ہاتھ نظر آرہے تھے۔ سامنے گرجا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گھڑیال نے بارہ بجائے۔ گھنٹے کی آواز دیر تک رات کی خامشی میں گونجتی رہی۔ میل وارڈ کی نرس گلاس کپڑے سے ناخن صاف کررہی تھی۔ لان میں تاریکی تھی اور ہوا بند تھی۔ ڈاکٹر اختر کی ری کنڈیشنڈ مزدا لان کے سرے پر کھڑی ہوئی تھی۔ منیرہ بے دلی سے پتھر کی بنچ پر بیٹھ گئی۔ بنچ کی ٹھنڈک اور شبنم کی نمی نے حبس کا احساس قدرے کم کردیا۔ فی میل وارڈ کے بیڈ نمبر ۱۳ کے پیشنٹ کے ساتھ والی لڑکی کھڑکی میں آکر کھڑی ہوگئی۔ وارڈ کے دھندلکے میں اُس کا معصوم بھولا بھالا چہرہ بڑا بھلا لگ رہا تھا وہ نوجوان اور قبول صورت لڑکی تھی۔ منیرہ کو اُس لڑکی کے کچے پن اور دوشیزگی پہ رشک آیا اور اُس نے حسرت سے ٹھنڈی سانس لی۔ دس سال پہلے۔ صرف دس سال پہلے وہ زیر لب بولی۔ جیسے کراہ رہی ہو۔ لمبی ٹھنڈی سانس ٹوٹ کر سسکیوں کی طرح پھیپھڑوں میں داخل ہوگئی۔

"وقت کے بے رحم ہاتھو۔ میرے دس سال مجھے لوٹا دو، میرے مہربان اور رحم کرنے والے خدا میری جھولی میں میرے ماضی کے دس سال ڈال دے"۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا وہاں کچھ بھی نیا نہ تھا۔ بس ایک تارا جو اُس کے دیکھتے دیکھتے ٹوٹا تھا اپنے پیچھے روشنی کی ایک لکیر چھوڑ گیا تھا۔ جیسے ماضی کے دھندلکوں میں یادوں کے ننھے ننھے دیئے ذہن کے افق پر جلتے بجھتے رہتے ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اُسے ایسا لگا جیسے وہ اپنے گاؤں کے آبائی مکان کی دہلیز میں کھڑی ہوئی مکان کے وسیع و عریض صحن کو دیکھ رہی ہے۔ فضا میں سیلن، اُپلوں اور دھوئیں کی جانی پہچانی بو رچی ہوئی ہے۔ آدھے آنگن میں دھوپ پھیلی ہوئی ہے اور بازار سے واپس لوٹتے ہوئے راہ گیروں کی پوٹلیوں میں سامان کے ساتھ بندھے ہوئے تازہ بھنے

ہوئے چینوں سے گلی سوندھی ہوگئی ہے۔ مکان اب شکستہ ہو چکا ہے۔ چھتوں کی کڑیاں نیچے کی طرف جھک آئی ہیں اور جگہ جگہ مکڑیوں کا جالا لگا ہوا ہے اور چڑیوں اور ابابیلوں کے گھونسلے بنے ہوئے ہیں۔ باورچی خانے والی دالان میں گھڑونچی پر گیروے رنگ کے خالی گھڑے لڑھک رہے ہیں۔ سیڑھیوں کے نیچے والی چھوٹی کوٹھری کے آدھے دروازے مٹی سے دب گئے ہیں۔ دوسرے دالان میں ایک تخت بچھا ہوا ہے۔ جس پر بے رنگ میلی سی دری بچھی ہوئی ہے اور ایک بوسیدہ چکٹ گاؤ تکیہ رکھا ہے تخت کے اوپر دیوار میں لکڑی کی خرادکی ہوئی رنگین کھونٹیاں لگی ہوئی ہیں جن میں اماں بی کی تسبیح اور جائے نماز ٹنگی ہوئی ہے۔ سارا گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ صحن میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں مرغیوں کے پر اور کنکر جمع ہیں۔ دیواروں پر جہاں برساتی پانی بہہ کر نیچے آتا رہا ہے سیاہی مائل سبز کائی کے دھبے نظر آرہے ہیں اور دراڑوں میں گھاس اُگ آئی ہے۔ گھونسلوں سے ابابیلیں اُڑ اُڑ کر باہر فضا میں چکر لگاتی ہیں اور پھر لوٹ کر اپنے گھونسلوں میں تھوڑی سی دیر رکتی ہیں پھر اڑ جاتی ہیں۔ دہلیز خالی پڑی ہے اور اونچی ڈیوڑھی والے بڑے دروازے زنگ آلود قلابوں میں تھکے تھکے جھول رہے ہیں۔

اس مکان کے بالائی حصے میں ۱۹۴۷ء کے بعد صرف دو نفوس رہ گئے تھے ایک اماں بی جن کی تسبیح اور جائے نماز کھونٹی پر ٹنگی رہتی تھی اور دوسری منیرہ جو ابابیلوں کو فضا میں اڑتے ہوئے ہمیشہ بڑی دلچسپی سے دیکھتی رہتی تھی۔ یہ اسی منیرہ کی کہانی ہے جو اس گھر میں ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئی اور چھبیس ۲۶ سال بھائیں بھائیں کرتے اس گھر میں اماں بی کے ساتھ رہی...

یہ اُسی منیرہ کی کہانی ہے۔

منیرہ نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ یوپی کے جاگیرداروں کا زوال پذیر خاندان تھا جن کی جاگیریں کئی پشتوں سے اولادوں اور پھر اُن کی اولادوں میں تقسیم ہو ہو کر اب صرف چند خود کاشت کھیتوں اور باغات تک سمٹ گئی تھیں اور جاگیریں غائب ہوگئی تھیں صرف اُن کے جھگڑے اور مقدمے رہ گئے تھے۔ بڑی حویلیوں، بڑے ناموں اور کرّ وفر

والے یہ جاگیردار اب قرض پر قرض لئے جاتے تھے اور اس پر سود در سود چڑھتا رہتا تھا اور جب زمین کا کوئی ٹکڑا یا کوئی باغ بک جاتا تو اُس قرض سے گلو خلاصی ہوتی تھی۔ یہ سب کے سب انتہائی نکمّے، بے ہنر، عیاش اور جھگڑالو تھے۔ گرمیوں میں آموں کی تقسیم پر، جاڑوں میں جانوروں کے چارے پر اور برسات میں پرنالوں پر لڑتے رہتے تھے۔ پھر اچانک گاؤں خالی ہونا شروع ہوا اور سب کے سب پاکستان چلے گئے۔ گاؤں میں ایک مہیب سنّاٹا پھیل گیا اور ایسا لگنے لگا جیسے گاؤں والے کسی کو دفن کرنے گئے ہیں اور ابھی تک نہیں لوٹے۔ منیرہ کو اکثر ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی پوچھ رہا ہو کون مر گیا ہے اور یہ سب کسے دفن کرنے گئے ہیں اور تم دہلیز میں کھڑی خالی خالی نظروں سے ان لمحے بھر میں گر جانے والی اپنی نیو سے کھسک جانے والی دیواروں کو کیوں دیکھ رہی ہو۔ یہ دیواریں کس نے بنائی تھیں۔ ان دیواروں کی تعمیر کس کی ایما پر ہوئی تھی۔ کن مشّاق ہاتھوں نے یہ لکھاوری سرخ اینٹیں ایک پر ایک اس خوبصورتی سے جمائی تھیں۔ ان دیواروں کی تعمیر میں کتنا عرصہ لگا ہوگا۔ یہ کس شاہ جہان کا تاج محل ہے۔ کبھی اُسے خیال آتا کہ اُس کے اجداد کا لمس ان دیواروں میں محفوظ ہوگا۔ اُن کی اولادوں نے ان دیواروں کی حفاظت میں کتنی مسرتیں سمیٹی ہوں گی۔ کتنے ڈولے ان دیواروں کے سہارے رُکے ہوں گے۔ کتنے ہی ننھے مُنے بچے یہاں پل کر کڑیل جوان ہوئے ہوں گے اور کتنے ہی جنازے اُٹھ گئے ہوں گے۔ اسے دیواروں کی آہیں اور سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ جیسے وہ ان دیواروں کا دکھ اور زبان جاننے لگی ہو۔ ان دیواروں نے اپنے چہیتوں سے جانے کیسے کیسے شکوے کئے ہوں گے۔

منیرہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ پتھر کی بنچ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ شبنم سے اُس کے کپڑے بھیگ رہے تھے۔ مریضہ کے ساتھ والی لڑکی نمعلوم کب سے ملاقاتیوں کے بنچ پر پیر سمیٹے بے سُدھ پڑی سو رہی تھی۔

منیرہ نے سوچا۔

کتنی یکسانیت تھی اُن دنوں۔ جب سے وہ جوان ہوئی تھی۔ بی اماں کی دعائیں بڑی لمبی ہو گئی تھیں۔ وہ نمازیں پڑھتیں اور ہر نماز کے بعد کسی اچھے سے رشتے کے لئے

بڑی عاجزی سے دعائیں مانگتیں اس لئے کہ وہ جوان ہو گئی تھی اور کفو کے لڑکے چپکے چپکے پاکستان چلے گئے تھے۔

وہ خاص طور سے عصر کی نماز کے بعد واسطوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیتیں اے معبود۔ اے مشکلوں کے حل کرنے والے۔ غوث پاک کا واسطہ۔ شہیدانِ کربلا کا واسطہ نواسۂ رسول کا واسطہ —— اور زرد دھوپ چھپاک سے ناغول والے دروازے کے اوپر جا کر غائب ہو جاتی اور بی اماں مغرب کی نماز کی نیت باندھ لیتیں۔

"اُن کی ایک بھی تو دُعا پوری نہ ہوئی۔ شاید اُن کے لئے قبولیت کے اور میرے لئے مستقبل کے دروازے بند ہو چکے تھے" منیزہ نے کہا۔

جس رات اماں بی کا انتقال ہوا اُس شام بھی وہ بڑے خلوص سے دعائیں مانگتی رہی تھیں۔ اُس نے پوچھا تھا "اماں بی دہلیز کا دروازہ بند کر آؤں۔

"اوں ہونہہ۔ نا ہیں۔ کوئی آیا تو پہاڑ جیسی سیڑھیاں کون اُترے چڑھے گا۔

"شاید اماں بی کو دھڑکا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی رشتہ آئے اور دروازہ بند دیکھ کر پھر جائے۔"

"اب یہاں کون آئے گا اماں بی۔ اتنی دیر ہو چکی" اُس نے دل میں کہا تھا۔ اس کھنڈر میں شام آ گئی اب بھلا کون آئے گا۔"

وہ اب چھبیس سال کی ہو چکی تھی۔

"اس کھنڈر میں کون آئے گا بھلا" اُس نے بلند آواز سے کہا۔ "تمہاری ایک بھی تو دعا پوری نہ ہوئی۔ بیکار کے وظیفے۔"

"نہیں لڑکی" اماں بی نے چیخ پڑیں "کفر بکتی ہے۔ دماغ چل گیا ہے توبہ کر توبہ۔"

پھر وہ خاموش ہو گئیں۔ چپ چاپ بستر پر لیٹ گئیں اور فجر کی نماز کو نہ اُٹھیں تب معلوم ہوا کہ انہیں بھی یقین آ گیا تھا کہ وظیفے بیکار ہی تھے۔ کوئی دعا قبول نہ ہوئی۔ وہ مر چکی تھیں انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اس کھنڈر میں کوئی نہ آئے گا۔

اماں بی کا جنازہ گھر سے نکل گیا اور گھر میں صرف منیزہ رہ گئی [illegible]

گھاؤ رِگا اور وہ بلبلا کر رہ گئی ۔ دیکھے بھالے مہربان چہرے اُس سے اجنبی سے لگے' اُن آنکھوں میں پہلے جیسی چمک نہ تھی ۔ دھواں دھواں کُملائے چہرے اس کی پہچان ہی میں نہ آسکے ۔ عین اس تنہائی میں اُسے خالہ جان یاد آئیں' خالو جان یاد آئے اور سلیم یاد آیا ۔ یہ لوگ کوئی دس سال قبل پاکستان چلے گئے تھے' خالہ جان چلتے چلتے اُسے سلیم کے لئے مانگ گئی تھیں اور اماں بی' خالہ جان اور سلیم کا انتظار ہی کرتی رہیں ۔ شروع شروع میں خالو جان کے خطوط آتے رہے کہ وہ جلد ہی آکر سلیم کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے پھر خطوط کا سلسلہ بند ہو گیا اور اماں بی نے نظریں اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو گاؤں جوان لڑکوں سے خالی ہو چکا تھا اور جوان لڑکیاں آموں کے پال کی طرح ہر گھر میں مہک رہی تھیں ۔

جس دن اماں بی کا انتقال ہوا تو خالو جان کو تار سے اطلاع دی گئی اور اسی دن سے اُس کی آنکھیں دروازے پر لگ گئیں ۔

اماں بی کا تیجہ ہوا' لیکن خالو جان' خالہ جان اور سلیم نہ آئے ۔

پھر چالیسواں ہو گیا لیکن کوئی نہ آیا ۔

جب برسی بھی ہو گئی اور کوئی نہ آیا تو اُس نے سوچا وہ سب کے سب کیسے بدل گئے یہ سب لوگ کس دنیا میں چلے گئے ہیں' جہاں خون سفید ہو جاتے ہیں' اماں بی کی موت گویا کوئی بات ہی نہ تھی ۔ وہ خالو جان وغیرہ سے مایوس ہو چکی تھی کہ ایک دن خالو جان پہنچ گئے' اُسے خیال ہی نہ رہا تھا کہ خالو جان اماں بی کے پُرسے کے لئے آئے ہیں ۔ اماں بی کی قبر نئی قبروں میں گم ہو چکی تھی اور اُن کا غم نئے دکھوں کی یورش میں دب گیا تھا ۔ خالو جان دیر سے آنے کے سلسلے میں معاشی اور قانونی مشکلات کا تذکرہ کرتے رہے' اماں بی کی بات تو کسی نے کی ہی نہیں ۔

خالو جان کے ساتھ پاکستان کے لئے روانہ ہوئی تو اُسے ایسا لگا جیسے اپنے پیچھے یادوں چاہتوں اور پیار کے خزانے چھوڑ چلی ہو ۔ جب بیل گاڑی کی سست رفتاری کے باوجود گاؤں ٹیلے بھر میں درختوں کے جھنڈ کے پیچھے چھپ گیا تو اُس کے اندر جیسے کوئی چیز چھن سے ٹوٹ گئی ہو ۔ وہ چپ چاپ کچی سڑک کے دونوں جانب گزرتے ہوئے جانے پہچانے چہروں کو گم ہوتا دیکھتی ہی ننگ دھڑنگ بچے درختوں کی جڑوں پر بیٹھے اُس کی بیل گاڑی پر قمچیوں کے سہارے

تنی ہوئی پردے کی سفید چادر دیکھتے رہے۔ اُسے یقین ہونے لگا کہ وہ یہ سب کچھ دوبارہ نہ دیکھ سکے گی۔ وہ یہاں کبھی لوٹ کر نہ آئے گی' اس کے اردگرد اتنا حسن اتنا پیار اتنی وجاہت بکھری پڑی تھی۔ اُسے اس کا علم ہی نہ تھا۔ اُسے گوشت سے ناخن جدا ہوتا ہوا پہلی بار محسوس ہوا۔ زمین پر پڑے ہوئے خشک پتے بیلوں کے پیروں اور بیل گاڑی کے پہیوں کے نیچے دب کر چرچر کی آواز کے ساتھ ٹوٹ رہے تھے یہ آواز اس سے پہلے بھی اسی طرح بیلوں کے پیروں اور گاڑی کے پہیوں کے نیچے دب کر ٹوٹتے ہوئے پتوں سے آتی ہوئی اُس نے کئی بار سُنی تھی لیکن آج تو جیسے پتے احتجاج کر رہے ہوں' کھیتوں پر اکا دکا بکریاں چر رہی تھیں اور کنوئیں پر آبپاشی کے لئے پانی کا بھرا ہوا پُر کھینچتے ہوئے ڈھلوان پر بھاگ کر اُترتے ہوئے بیلوں کے گلوں میں پڑی جھانجھریں بج رہی تھیں اور کنوئیں کی گراری بھرے ہوئے پُر کے بوجھ سے چرچرا رہی تھی۔ یہ جانی پہچانی ہوئی آوازیں آج اُسے جیسے الوداع کہہ رہی تھیں۔

منیرہ نے تنی ہوئی چادر کے اندر اپنے ریزہ ریزہ وجود کو سمیٹنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے آنکھوں کے آنسو خشک کئے اور اپنے آپ سے سوال کیا۔

"ایسا بھی ممکن ہے کیا۔ کہیں ایسا بھی ہوتا ہے۔ لوگ اس طرح بھی اپنے گھروں سے بے گھر ہوتے ہیں یہاں اُس کی اپنی زمین ہے جس کی خوشبو میں وہ پیدا ہوئی ہے۔ جس پر گھروندے بناتے' بگاڑتے وہ جوان ہوئی ہے۔ یہاں اس کا اپنا گھر ہے جہاں اُس کے اجداد سالہا سال سے پیدا ہوتے اور مرتے رہے۔ یہاں وہ مسجد ہے جس کے مکتب میں اس نے قرآن پڑھا ہے۔ ایسا کسی طرح ممکن نہیں' اسطرح کسی کا گاؤں' کسی کا گھر چھنتا ہے جو اُس کا چھن جائے گا۔ یہاں سے جب بھی کوئی گیا ہے' اپنے نقش قدم تلاش کرتا ہوا ضرور لوٹا ہے۔ پھر وہ کس طرح جا رہی ہے۔ وہ اپنے نقشِ قدم کہاں تلاش کرے گی' وہ ایسا نہ ہونے دیگی۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر کس زمین پر اُس کے قدم جم سکیں گے۔ کس گھر کو وہ اپنا گھر کہہ سکیگی۔

میں نہیں جاؤں گی' مجھے کہاں لیجا رہے ہو" اس نے چیخ کر کہا۔ لیکن اس کے حلق سے آواز ہی نہ نکل سکی۔

چھن چھن ۔ چھن چھن ۔ چھن

بیل گاڑی اُس ندی پر بنے ہوئے پل سے گزری جو گاؤں کی کچی سڑک کو اسٹیشن جانے والی پختہ سڑک سے مِلاتی تھی اور بیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی جھانجھریں بجنے لگیں۔ خالو جان بیل گاڑی کے بانس سے سر ٹکائے خراٹے لے رہے تھے۔ جیسے ساری عمر جاگتے رہے ہوں اب پہلی بار سونے کا موقع مِلا ہو اور وہ سڑک کے دونوں جانب کے مناظر اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی جیسے ساری عمر سوتی رہی ہو اب جاگی ہو اور گاڑی بان کچھ سویا ہوا سا کچھ جاگا ہوا سا بے دلی سے بیلوں کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے جھکولے کھا رہا تھا اور بیل گردنیں ہلاتے اور جھانجھر بجاتے چلے جا رہے تھے۔

گاؤں سے اتنے بڑے شہر میں آ کر اُسے ایسا لگا جیسے چھوٹے چھوٹے دو کمروں میں اُسے قید کر دیا گیا ہو، ان دو کمروں میں ایک کی چھت پختہ تھی اور دوسرے پر ٹین کی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ کراچی پہونچی تو رات ہو چکی تھی اور سارا شہر قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔

"اِتنی بڑی بڑی موٹریں۔ اِتنی چوڑی چوڑی اور چمکدار سڑکیں اور اِتنی ڈھیر ساری رنگین روشنیاں یہاں تو دیوالی کا سا سماں ہے"

اُس نے پہلی بار جب جلتی بجھتی ہوئی روشنی میں لکھے ہوئے حروف دیکھے تھے تو بڑی حیرت ہوئی وہ دیکھتی ہی رہ گئی۔ روشنی کے حروف، دیواروں پر حروف، عمارتوں کی چھتوں پر حروف، چوراہوں پر حروف ــــ

"اللہ یہ شہر تو جیسے حرفوں کا بنا ہوا ہے"

جب شہر کے ایک مصروف بازار سے گزرتے ہوئے اُس نے چاروں طرف انسانوں کا ہجوم دیکھا تو اُسے وحشت ہونے لگی۔ دوکانوں پر، ہوٹلوں میں، مختلف سواریوں پر، فٹ پاتھ پر، سڑک پر اُسے ہر طرف لوگوں کو چلتا پھرتا دیکھ کر احساس ہونے لگا کہ جیسے وہ آدمیوں کے جنگل میں راستہ بھول گئی ہے۔

خالو جان اُسے لے کر جس مکان میں پہنچے وہ چھوٹے چھوٹے ۲ کمروں پر مشتمل تھا اور گھر میں لالٹین کی ملگجی روشنی تاریکی میں اور اضافہ کر رہی تھی۔ اچانک اس طرح منظر بدل جانے سے اُسے دھچکا سا لگا۔ روشنیاں کم ہوتے ہوتے اندھیرے میں بدل گئی تھیں۔ اُس کی

نگاہیں سلیم کو تلاش کر رہی تھیں۔ بچپن کی منگنی نے اُسے سلیم کی پرستش کرنا سکھا دیا تھا۔ اُس کے دل میں سلیم کا پیار جڑ پکڑ چکا تھا۔ خالہ جان بوڑھی ہو چکی تھیں۔ جب انہوں نے بلائیں لے کر انگلیاں چٹخائیں اور اُس سے لپٹ لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئیں تو اُسے اماں بی یاد آگئیں۔ خالہ جان کے جسم سے اماں بی کی خوشبو آ رہی تھی اور آوازیں اماں بی کے لہجے کی مٹھاس تھی لیکن اُن کے سارے جسم پر افلاس اور مایوسی لکھی ہوئی تھی۔ خالو جان برآمدے میں جاکر خراٹے لینے لگے تھے۔ خالہ جان اُسے لے کر کمرے کے اندر چلی گئیں اور گاؤں کا حال سُنکر روتی رہیں اور اُسے بھی رُلاتی رہیں۔ کافی رات گئے جب سلیم نے دروازہ کھولو کی آواز دی تو صحن میں رکھے ہوئے پنجرے سے طوطے نے آواز لگائی۔

"حرامی۔ شرابی"

"حرامی۔ شرابی"

"یہ طوطا کیا کہتا ہے" اُس نے خالہ جان سے پوچھا۔

"ابھی تو آئی ہو۔ اس کی زبان بھی سمجھ لوگی"۔

"دروازہ کھولو" سلیم زور سے چیخا۔

خالہ جان نے دروازہ کھولدیا

"میں اس طوطے سالے کی ٹانگیں چیر دوں گا"۔

"منیرہ آگئی ہے سلیم" خالہ جان نے کہا۔

"تو میں کیا کروں آگئی ہے تو"۔

خالہ جان سلیم کو ڈھکیل کر دوسرے کمرے میں لے گئیں اور اُن پر دل کا دورہ پڑ گیا۔

"سلیم شراب پیتا ہے" منیرہ نے دل میں کہا۔ اُسے ایسا لگا جیسے اُس کے سہارے کا تنکا بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔ وہ رات بھر روتی رہی اور اس کے ذہن میں طوطے کے پر پھڑپھڑاتے رہے۔

"شرابی۔ حرامی"

صبح سلیم سے گفتگو کرتے ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ وہ کسی اجنبی سے گفتگو کر رہی ہے۔ ہر وقت

شرارتیں کرنے والا سلیم جو اُس کے ذہن کے گوشوں میں محفوظ تھا کہیں گم ہو چکا تھا۔ ماہ و سال کی گردش نے جہاں اُس سے بہت کچھ چھینا تھا وہاں سلیم بھی محفوظ نہ رہ سکا تھا۔

"سلیم تم کہاں ہو"

"اماں بی تم کہاں ہو"

"میرا گھر کہاں ہے"۔

سب کچھ تھوڑے ہی دنوں میں تلپٹ ہو چکا تھا۔ اُس نے سلیم کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں پھر اس چھوٹے سے مکان کو دیکھا۔ ایک کمرے میں وہ اور خالہ بی گزشتہ رات سوئی تھیں اور دوسرا کمرہ جس پر ٹین کی چھت تھی اُس میں خالو جان اور سلیم سوئے تھے۔ خالو جان صبح ہی صبح فیکٹری چلے گئے تھے اور سلیم ابھی ابھی سو کر اُٹھا تھا۔ اس کمرے کے ساتھ چھوٹا سا باورچی خانہ تھا اور صحن میں دیوار کے ساتھ سورج مکھی کے پودے میں تین زرد مرجھائے ہوئے پھول جھول رہے تھے۔ صحن میں ایک جھلنگا چارپائی پڑی ہوئی تھی جس کے سیاہی مائل بان ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر لٹک رہے تھے۔

"خالہ جان" اس نے پوچھا "خالو جان کب چلے گئے"۔

"پانچ بجے صبح چلے جاتے ہیں۔ آج کل پہلی شفٹ ہے"۔

"کب آئیں گے"

"چار بجے شام کو۔ اور جب تیسری شفٹ ہوتی ہے تو رات کو آٹھ بجے جاتے ہیں اور صبح چھ بجے آتے ہیں"۔

"خالو جان فیکٹری میں کیا کام کرتے ہیں" اس نے پوچھا

"نوکری"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں مگر کیا کام کرتے ہیں وہاں"

خالہ بی ایکدم خاموش ہو گئیں۔ وہ یہ نہ بتانا چاہتی تھیں کہ خالو جان جو ساری عمر گاؤں میں نکھے رہ کر بھی تر نوالے توڑتے رہے اب مل میں مشینوں کے نیچے جھاڑو لگاتے رہتے ہیں اور انہیں آتا بھی کیا تھا۔ لاڈ میں تعلیم نہ حاصل کی۔ کوئی اور ہنر شان گھٹنے کے خیال سے نہ سیکھ سکے اب تو یہ ہی بہت تھا کہ انہیں کام مل گیا تھا۔

سلیم ماں کی خاموشی کا سبب تاڑ گیا۔

"مزدوری کرتے ہیں۔ اپنے حصے کا کام کرتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں" سلیم نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا" منیرہ زندہ رہنے کے لئے ہر فرد کو کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ یہ مزدور ہی ہیں جو معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مزدور اور کسان ہمیں آسائشیں پہنچاتے ہیں اور خود ہر آسائش سے محروم رہتے ہیں۔ یہاں عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں۔"

"عورتیں کیا کام کرتی ہیں۔"

"اسکولوں میں پڑھاتی ہیں۔ ڈاکٹر ہیں، نرس ہیں، فیکٹریوں میں کام کرتی ہیں۔"

"آپ کیا کام کرتے ہیں سلیم بھائی۔"

"آوارہ گردی" خالہ جان بولیں" صبح گھر سے نکل جاتا ہے اور رات گئے گھر لوٹتا ہے۔ کہتا ہے مزدوروں کی خدمت کرتا ہوں۔ جب تک کالج میں تھا طالب علموں کی خدمت کرتا تھا چنانچہ تعلیم ادھوری چھوڑ دی اب مزدوروں کی خدمت کرتا ہے۔ تقریریں کرتا ہے جلوس نکالتا ہے۔ اور پولیس سے چھپتا پھرتا ہے۔ گھر جو ایک پیسہ بھی کما کر لایا ہو۔ جو اپنوں کا نہ ہوا وہ کسی اور کا کیا ہوگا جو ماں باپ کے کام نہ آسکتا ہو وہ مزدوروں کی خدمت کیا کرے گا۔ ہر طرح کی اخلاقی پابندی سے بچنے کے لئے مذہب کا مذاق اُڑاتا ہے۔ کہتا ہے مذہب ڈھکوسلہ ہے۔ سیدھے سادھے مزدوروں کو مذہب کے نام پر لوٹا جاتا ہے۔ جب مذہب کی نفی کردی ماں باپ کا حق نہ ادا کیا تو پھر ہر چیز جائز ہوگئی۔ شراب اس لئے پیتا ہے کہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ سب پیتے ہیں۔ کوئی تجارت یا ملازمت اس لئے نہیں کرتا ہے کہ اسی کی طرح کئی اور نوجوان وہاں اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اب یہ مادر پدر آزاد ہے، جسے چاہے گالیاں دے جو چاہے کرے اس کی ذات پر کسی کی طرف سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ دیکھا تم نے ایک مذہب کی نفی کردینے سے میرے بیٹے کو کیسی آزادی کی نعمت میسر آگئی ہے۔"

"امی آپ یہ کیسا رونا لے بیٹھیں۔" سلیم نے ڈھٹائی سے کہا۔

"میں یہ رونا نہیں لے بیٹھی۔ سارے محلے میں یہ ہی رونا ہے۔ پڑوس کی بڑھیا دن بھر حلق پھاڑ پھاڑ کر شرابی، حرامی، چیختی رہتی تھی۔ تین سال سارا سارا دن اُس کا یہ ہی کلمہ تھا۔ اُس نے کسی

کا نام کبھی نہیں لیا۔ لیکن میں یہ جانتی تھی کہ تو راتوں کو دیر سے آ کر شور کیا کرتا ہے' یہ اس کا طعنہ مجھے ملتا تھا۔ آج اسے مرے ہوئے تیسرا مہینہ ہے۔ اب تیرا اپنا طوطا تجھے خوش آمدید کہتا ہے اور تو اسے ہر رات جان سے مار دینے کا اعلان کرتا ہے" خالہ جان آبدیدہ ہو گئیں۔

"چھوڑیئے اس فکر کو خالہ جان" منیرہ نے موضوع بدلنے کے خیال سے کہا۔

"بیٹی تم اب اس گھر کی ایک فرد ہو' یہ سب کچھ میں تمہیں بتانا ہی چاہتی تھی۔ سلیم نے میری کبھی نہیں سنی' نہ اب سنے گا" خالہ جان نے کہا۔

اِس سلیم بھائی" منیرہ سلیم سے مخاطب ہوئی۔

"یہ زندگی کا فلسفہ ہے' معاشرے کی گرہیں ہیں' سیاسی اونچ نیچ ہے' اسے نہ امی سمجھ سکتی ہیں نہ تم سمجھو گی۔"

سب خاموش تھے۔

"سلیم بھائی میں کوئی کام کر سکتی ہوں۔" منیرہ نے پوچھا

"کیوں نہیں' ہمیں لڑکیوں کی سخت ضرورت ہے۔ تم میرے ساتھ کام کرو' جس تحریک میں آزاد اور روشن خیال لڑکیاں شریک ہو جائیں' اس میں جان پڑ جاتی ہے۔"

نہیں منیرہ تم اس کے ساتھ کوئی کام نہیں کرو گی" خالہ جان نے کہا۔

"کیوں خالہ بی!" منیرہ نے پوچھا

"اس کے ساتھ کام کرنے کا مطلب ہے دین سے غداری' ملک سے غداری اور شرافت کی زندگی سے کنارہ کشی" خالہ جان غصے سے بولیں۔

"چلو نہ سہی۔ میرے ساتھ سماجی کام نہ کرو' میں تمہیں نرسنگ اسکول میں داخل کرا دوں گا تربیت یافتہ نرس کو تنخواہ بھی اچھی مل جاتی ہے اور امی کی دیکھ بھال بھی ہو جایا کرے گی۔ ان کو دل کا دورہ پڑتا ہے' تم آسانی سے سنبھال لیا کرو گی۔" سلیم نے کہا۔

"آپ کوئی نوکری کیوں نہیں کرتے" منیرہ نے سلیم سے پوچھا

"میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔ غلامی مجھے پسند نہیں" سلیم نے سوکھے منہ سے کہا۔

"آزادی' بے لگام اور بے مقصد زندگی گزارنے کا نام آزادی تو نہیں"۔ خالہ بی بولیں۔

"آپ لوگ میرے مسائل کو نہیں جانتیں" سلیم نے کہا

وہ کون سے مسائل ہیں جو گناہوں کی طرح چھپائے جاتے ہیں" خالہ جان نے انتہائی غصہ سے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

منیرہ کے دل میں مایوسی سانس کے ساتھ اُترتی چلی گئی۔ اُس کا جی بیٹھنے لگا۔ اُس نے سوچا: یہ چھوٹا سا گھر، مختصر سا خاندان، مگر خوشی کا دور دور کوئی نشان نہیں۔ خالو جان اس عمر میں فیکٹری میں مزدوری کرتے ہیں۔ راتوں کو جاگتے ہیں، خالہ جان کو سلیم کی آوارگی اور نکمے پن نے کھالیا وہ دل کے مرض میں مبتلا ہیں اور سلیم کسی طرح کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں۔ نہیں معلوم وہ کیا کرتا ہے۔ شراب خانوں اور کافی ہاؤسوں میں خرچ کے لئے پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ اُس نے کبھی گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ پولیس سے چھپتا پھرتا ہے۔ کام کرنے کی بات کرو تو پراسرار باتیں کرنے لگتا ہے۔

اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑی ہوگی۔ وہ نرسنگ اسکول میں داخلہ لے گی۔ ملازمت کرے گی۔ اس گھر میں خوشیاں لائے گی وہ سلیم کو سیدھی راہ دکھائے گی اسے کچھ کرنے پر مجبور کرے گی۔ وہ یہ چیلنج قبول کرے گی۔ اُس کے پاس حوصلہ ہے عزم ہے اور محبت اور آنسوؤں کا خزانہ ہے۔ وہ سلیم پر سب کچھ قربان کردے گی اور اُسے اس گھر میں گھر کے ذمہ دار فرد کی طرح واپس لائے گی۔

ٹریننگ ختم ہونے کے بعد جب ہسپتال سے میٹرنٹی وارڈ میں پوسٹنگ کا مراسلہ ملا تو منیرہ کو بے اندازہ خوشی ہوئی۔ اس نے ٹریننگ کا زمانہ بڑے ضبط اور سکون سے گزارا تھا۔ شروع شروع میں تو یہ فاصلہ اتنا طویل محسوس ہوتا کہ وہ مایوس ہوجاتی مگر جس دن ٹریننگ ختم ہوئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اُس میں ایک طرح کی خود اعتمادی پیدا ہوگئی۔ اور اس لمحے جبکہ وہ میٹرنٹی وارڈ میں نرس مقرر کردی گئی تو اُسے گزرے دنوں کی اذیتیں بھی خوشگوار محسوس ہو رہی تھیں۔

"آج تو مجھے ٹریٹ کا حق ہے" سلیم نے تقرری کا پروانہ دیکھ کر کہا۔

اب وہ سلیم کو اپنی دانست میں اچھی طرح سمجھنے لگی تھی۔ وہ اجنبیت جو اُسے پہلی صبح محسوس ہوئی تھی ختم ہوچکی تھی۔ سلیم ٹریننگ کے دوران پابندی سے اُسے اسکول سے لینے آتا۔

وہ روزانہ شام کو کافی ہاؤس میں چائے پیتے۔ معاشی نظام پر بحث کرتے یا پکچر دیکھتے۔ اس نے کبھی سلیم سے اس کی شراب نوشی یا آوارہ گردی پر براہ راست کوئی گفتگو نہ کی تھی۔ نہ کبھی اُس نے اُس سے اُن روپوں کے بارے میں پوچھا جو کافی ہاؤسوں اور پکچروں پر وہ خرچ کیا کرتا تھا۔ نہ سلیم نے خود ہی کبھی اس موضوع پر بات کی۔ رات دیر سے سلیم جب بھی نشے میں دھت آتا تو وہ فوراً دروازہ کھول دیتی اور کسی کو علم تک نہ ہوتا کہ کب سلیم گھر آیا۔ صرف طوطا ایک دو دفعہ شرابی حرامی کہہ کر چپ ہو جاتا۔ اُس نے سلیم کے نظریات سے اتفاق کرنا سیکھ لیا تھا' اُس کے خیال میں سلیم ایک عظیم انسان تھا۔ عام انسانوں سے بلند۔ وہ دوسروں کے لیے جیتا تھا۔ وہ مزدوروں کے حق کے لئے لڑتا تھا اور اسی لئے قدامت پسند سرمایہ دار اُس کے خلاف تھے۔ اپنے لئے جینا بھی کوئی جینا ہے۔

"ہاں آج ہم کامریڈ کو ٹریٹ دیں گے" منیرہ نے کہا

اس سے پہلے کئی بار وہ سلیم کے ساتھ پکچر جا چکی تھی، لیکن آج تو ہوا کے دوش پر اڑ رہی تھی فٹ پاتھ پر سے گزرتے ہوئے وہ بڑے بڑے شوکیس میں روشنی سے جگمگاتی ہوئی چیزیں ہمیشہ ہی سے دیکھا کرتی تھی لیکن آج اُسے اپنے اور ان چیزوں کے درمیان کا فاصلہ اچانک ختم ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ اب ان چیزوں کو چھو بھی سکتی ہے' ان پر قابو پا سکتی ہے۔ آج سلیم کے ساتھ چلتے ہوئے اُسے اپنا قد بھی اونچا محسوس ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے جب وہ سلیم کے ساتھ کہیں جاتی وہ سلیم کو اپنا محافظ اور نگراں سمجھتی تھی لیکن آج اپنے آپ کو اپنا محافظ اور نگراں سمجھ رہی تھی' اس کی چال میں خود اعتمادی اور ذہن میں فیصلہ کرنے کی قوت پیدا ہو گئی تھی۔

سینما ہال میں پکچر دیکھتے ہوئے سلیم اُس کے خون میں رچ بس گیا تھا۔ وہ ہال کی آخری قطار میں ایرو کارنر سیٹ پر اُس پر جھکا ہوا تھا۔ دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں اور انگلیاں ایک دوسرے کی انگلیوں میں کھبی ہوئی تھیں۔ سانسیں ایک دوسرے کے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں' اُنہیں گردوپیش کا کوئی ہوش نہ تھا۔ دونوں کے دِلوں میں اس انمٹ لمحے کی حلاوت گھلی ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں موندے کچھ کچھ جاگی اور کچھ کچھ سوئی ہوئی سی سوچ رہی تھی کہ کاش یہ لمحے ہمیشہ کے لئے ساکت ہو جائیں۔ بس کائنات اسی طرح یونہی ٹھہر جائے' اس لمحے

سے قبل کے سارے لمحے مٹ جائیں اُس کی زندگی سے الگ ہو جائیں اور اس لمحے کے بعد پھر کوئی لمحہ نہ آئے۔ اُس نے سلیم کا بازو پوری قوت سے پکڑ رکھا تھا اور سر اُس کے کاندھے پر پوری خود سپردگی سے رکھ دیا تھا۔

سلیم نے اُس کے کان میں کہا۔

"منیرہ"

"ہوں"

"منیرہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"

برسوں پرانے دیکھے ہوئے خواب اُس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

"منیرہ میں بہت جلد تمہیں اپنا لینا چاہتا ہوں"

"ہوں"

"میں آج ہی امی سے بات کر دوں گا' اب تمہاری ٹریننگ ختم ہو چکی ہے اور تمہیں سروس بھی مل گئی ہے۔

منیرہ نے سلیم کا بازو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑے ہوئے دل میں سوچا "سلیم اس کا شوہر اس کا اپنا گھر۔ اُس کے ننھے منے بچے"

"اللہ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی" منیرہ نے اپنے آپ سے کہا

رات جب وہ دونوں گھر پہنچے تو خالہ جان کو دل کا شدید دورہ پڑ چکا تھا اور وہ بے حس بستر پر پڑی ہوئی تھیں۔ خالو جان پاس بیٹھے رو رہے تھے' اُس نے آہستہ سے کہا خالہ جان لیکن خالہ جان نے نہ آنکھیں کھولیں نہ منہ سے کچھ بولیں۔ وہ کب کی مر چکی تھیں۔ منیرہ کے چند لمحے پہلے دیکھے ہوئے خوبصورت خواب بکھر کر خالہ جان کے جنازے پر پھیل گئے۔

خالہ جان کو مرے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ سارے گھر پر ویرانی چھا گئی تھی۔ گھر کا ماحول گھر جیسا نہ رہ گیا تھا۔ خالو جان ڈیوٹی پر چلے جاتے یا خاموشی سے گھر میں پڑے رہتے سلیم گھر آتا اور منیرہ سے کچھ دیر باتیں کرتا پھر چلا جاتا۔ وہ خود پابندی سے ہسپتال جاتی اور ڈیوٹی ختم کر کے چپ چاپ گھر میں چھوٹے موٹے کام کر کے پڑی رہتی۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس

گھر کے اندر اپنی کوئی گمشدہ شئے تلاش کر رہے ہوں۔

اُس رات خالو جان کی رات کی ڈیوٹی تھی اور وہ تنہا تھی۔ رات گیارہ بجے تھے کہ سلیم نے دروازہ پر آواز دی۔

"دروازہ کھولو"

"شرابی۔ حرامی" طوطا چیخا۔

منیرہ جاگ رہی تھی اُس نے دروازہ کھولا۔ ہوا کے ساتھ شراب کا بھبکا اور سلیم گھر میں داخل ہوئے خوف سے منیرہ کا دل دھڑکنے لگا۔ سلیم چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُس نے بھی سلیم سے بات کرنی مناسب نہ سمجھی۔ خاموشی سے اپنے بستر پر لیٹ کر سو گئی۔

جب اُس کی آنکھ اچانک کھلی تو سلیم اُس پر جھکا ہوا تھا۔

"سلیم بھائی" اُس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ سلیم اُس کی چارپائی پر بیٹ گیا۔

"سلیم بھائی"

"منیرہ خاموش رہو"

"نہیں"

"میں تمہارا شوہر ہوں"

"نہیں"

"تم میری ہو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میرا تمہارے اوپر حق ہے۔"

"نہیں"

"منیرہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر تم نے ضد کی تو میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

جانے کیوں اس بار منیرہ کے منہ سے "نہیں" نہ نکل سکا۔

منیرہ کی مسلسل نہیں کے باوجود بالآخر ہوا وہی جو سلیم نے چاہا۔ سلیم تمام رات بدمست اسی کمرے میں رہا جس میں منیرہ کی نہیں نے پہلی بار آخری ہچکی لی تھی۔ سلیم تمام رات منیرہ سے شادی کا وعدہ کر کے اُسے لوٹتا رہا اور منیرہ اِن وعدوں پر اعتبار کر کے لٹتی رہی۔ صبح خالو جان کے آنے سے پہلے منیرہ اپنے بستر پر سلیم کو سوتا ہوا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

تمام دن منیرہ وسوسوں شکوک اور پچھتاوے کے کرب میں مبتلا رہی۔ اب اُسے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ کہیں سلیم اُسے چھوڑ ہی نہ دے کہ اُس کا یہ آخری سہارا بھی جاتا رہے۔ اب صرف سلیم ہی اُس کے سہارے کا تنکا تھا۔ وہ سب کچھ کھو کر اب اس تنکے کو کسی قیمت پر نہ کھونا چاہتی تھی

"تنکے کا سہارا ہی کیا" منیرہ نے سوچتے سوچتے اپنے آپ سے کہا "اور پھر تنکا بھی سلیم جیسا، جو کوئی کام نہیں کرتا ہے شراب پیتا ہے، کافی ہاؤسوں میں آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے اور پھر اپنی خالہ زاد بہن، بے سہارا، عزیز لڑکی اور اپنی منگیتر کو شراب کے نشے میں RAPE کرتا ہے۔"

اُسے سلیم سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔

"اس چھوٹے سے واقعے کو ایسے بھیانک خدوخال میں نہ دیکھو" منیرہ کے دل سے آواز آئی۔

"YES OF COURSE IT IS RAPE" اُس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

اور رونے لگی۔ بین کرنے لگی

"کامریڈ سلیم تم نے یہ کیا کیا"

"تم نے سب کچھ SPOIL کر دیا۔"

"اب پہلے جیسا تو کچھ بھی نہ رہا۔ نہ کبھی ہو سکتا ہے سلیم بھائی۔"

اُس کے سینے پر ایک گھونسہ سا لگا۔

خالہ زاد بھائی

پھوپھی زاد بھائی

ماموں زاد بھائی

چچا زاد بھائی

"یہ سارے رشتے جھوٹے ہیں" منیرہ نے سوچا۔ اُس پر اُس کے خالہ زاد بھائی نے پاکیزہ زندگی کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ یہ سارے مرد ایک جیسے ہیں اور حد درجہ خود غرض ہیں،

منیرہ سلیم کو کھو دینے کا غم برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اُس کے [illegible]

چوروں کی طرح دبے پاؤں داخل ہو رہے تھے ۔ وہ جب اپنی گزشتہ زندگی کا جائزہ لیتی اُسے ایسا لگتا جیسے وہ منیرہ نہیں کوئی اور ہے ۔ وہ اپنے آپ کو ہی موردِ الزام ٹھہراتی ۔ اگر وہ حالات کا مقابلہ کرتی، اپنے آپ پر بھروسہ کرتی تو یہ حالات نہ ہوتے ۔ لیکن وہ بالآخر سلیم کو حاصل کر لینے ہی میں گناہوں کا کفارہ سمجھتی اور اسی لئے سلیم کے سامنے موم ہو جاتی ۔

تم اس قدر احمق کیوں ہو ۔ یہ ہماری ضرورت ہے ۔ اس سلسلے میں اتنا زیادہ ٹچی اور خائف ہونے کی ضرورت نہیں ۔" سلیم نے منیرہ کی برین واشنگ شروع کی ۔

"جس طرح ہم اپنی دوسری ضروریات پوری کرتے ہیں بالکل اُسی طرح اس فطری ضرورت کو پورا کرنا ہمارے اختیار میں ہے اور یہ ہمارا حق ہے ۔ اس کا کسی تیسرے فرد سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ صدیوں پرانی غیر فطری بندشوں کو اپنے اوپر طاری کر لینے کا نام جہالت اور پسماندگی ہے ۔ جنسی خواہشات کی تکمیل سے غیر فطری گریز کئی طرح کی نفسیاتی الجھنیں اور پیچیدگیاں تو پیدا کر سکتا ہے لیکن کوئی صحتمند نتیجہ نہیں برآمد ہو سکتا سوائے محرومی اور ڈپریشن کے ۔ جو کچھ ہم نے کیا ہے وہ ہماری ضرورت ہے بس ۔"

"لیکن ، ہم شادی کیوں نہ کریں" منیرہ نے شکست تسلیم کرتے کرتے سنبھالا لیا ۔

"بیشک ہم شادی کریں گے اور جلد کریں گے ۔ کیوں کہ یہ ایک فضول سی رسم ہمیں ایک طرح کی طمانیت دیتی ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی افادیت نہیں ۔"

اُس کے بعد خالو جان کی ڈیوٹی جب دن میں ہوتی تو تمام دن اور جب رات کی ہوتی تو رات کو سلیم پابندی سے گھر میں موجود رہتا ۔ منیرہ سلیم کی دی ہوئی دوائیں بڑی سعادتمندی سے استعمال کرتی ۔ اور اس کی ہدایت کے مطابق کسی دن دوا کے استعمال میں کوتاہی نہ کرتی سلیم بڑی مستعدی سے شادی کے وعدے کرتا رہتا اور ان وعدوں کے سہارے منیرہ اور سلیم شادی کے بغیر ہی ازدواجی زندگی گزارتے رہے ۔

مئی کی اس یادگار شام کو منیرہ اور سلیم گھر سے رات کا کھانا کھانے اور پکچر دیکھنے کے پروگرام سے باہر نکلے ۔ منیرہ نے خالو جان کا کھانا میز پر رکھ دیا تھا ۔ جب وہ دونوں شہر کے ایک مشہور رہائشی ہوٹل میں داخل ہوئے تو منیرہ کا دل کسی انجانے خوف سے آپ ہی

آپ دھڑکنے لگا۔ یہ ہوٹل ریلوے لائن کے قریب تھا اور جب وہ دونوں سیڑھیاں چڑھ رہے تھے اُس وقت رات کے نو بجے تھے اور کوئی ٹرین شور مچاتی ہوئی ریلوے لائن پر گزر رہی تھی۔ منیرہ کو ٹرین کی آواز کے ساتھ ہی وہ سفر یاد آیا جو اُس نے مسلسل تین دن ٹرین پر بیٹھ کر خالو جان کے ساتھ طے کیا تھا۔ وہ اُس کی زندگی میں ایک نیا موڑ تھا۔ جب وہ دوسری منزل پر پہنچی تو ٹرین گزر چکی تھی اور اُس کی آواز تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

ہوٹل کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں سلیم کی ملاقات احمد بخش سے ہوئی جو کسی دور دراز کے گاؤں کا بڑا زمیندار تھا۔ سلیم نے منیرہ کو احمد بخش سے متعارف کرایا اور تینوں اُسی کمرے میں چائے پینے بیٹھ گئے۔ منیرہ نے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک ڈبل بیڈ، ڈریسنگ ٹیبل، ڈائننگ ٹیبل جس پر بیٹھے وہ سب اس وقت چائے پی رہے تھے۔ ایک طرف صوفہ سیٹ پڑا ہوا تھا۔ ڈبل بیڈ کے عین اوپر ہلکے نیلے شیڈ کی لائٹ تھی اور عین سامنے دوسری دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل تھی جس کے قدِ آدم آئینے میں پورا بیڈ نظر آ رہا تھا۔ اُسے یہ کمرہ، احمد بخش اور سلیم سب اجنبی سے لگے۔ جیسے یہ سب کچھ بظاہر جس طرح نظر آ رہا ہے اصل میں اُس طرح نہیں ہے۔ اور سلیم بھی سلیم نہیں ہے۔ جیسے اِن سب کے پیچھے کوئی بڑی سازش ہے۔ جیسے اُسے اس جگہ کوئی خطرہ پیش آنے والا ہے اندر سے کسی نے اُس سے کہا تو یہاں کیا لینے آئی ہے۔

"منیرہ میں ذرا کھانے کا آرڈر دے کر آتا ہوں۔" سلیم نے عین اُس وقت کہا جب منیرہ سلیم سے اس کمرے سے نکل چلنے کے لئے کہنے والی تھی۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" منیرہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"تم بیٹھو۔ میں ایک منٹ میں آیا۔" اور سلیم منیرہ کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا اور اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ بند کرتا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی منیرہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُسے جس ٹرین سے سفر کرنا تھا وہ ابھی ابھی چھوٹ گئی ہے اور پلیٹ فارم پر وہ تنہا کھڑی ہے اور لوگ اُسے دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ اُس کا دل گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلنے لگا۔

"بائی جی ڈرو نہیں۔ ہم اچھا آدمی ہے۔" احمد بخش نے کہا

اس آواز کے ساتھ ہی اُس نے احمد بخش کی طرف دیکھا جیسے وہ ایک لمحے کے لئے بھول گئی تھی احمد بخش کے زرد دانت نظر آرہے تھے وہ ہنس رہا تھا منیرہ کو یقین ہو گیا کہ ٹرین چھوٹ چکی ہے اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے آپ کو بیدار رکھنے کی کوشش کی لیکن آنکھوں کے سامنے اندھیرا گہرا ہوتا چلا گیا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی مگر ایک قدم بھی نہ اُٹھا سکی اور احمد بخش کے بازوؤں میں جھول کر رہ گئی۔

"بائی جی ڈرو نہیں۔ ہم اچھا آدمی ہے"

"بائی جی ڈرو نہیں"

"بائی جی" ـــ آواز بہت دور سے آئی۔

رات گئے منیرہ کی آنکھ کھلی تو اس پر ساری حقیقت کھل گئی۔ اس کا گلا خشک تھا، زبان کسیلی تھی۔ سر گھوم رہا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا۔ چاروں طرف پُراسرار خاموشی تھی کمرے کے باہر ہر چیز نیند میں ڈوبی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر چائے کی پیالیاں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ بیڈ کے عین مقابل ڈریسنگ ٹیبل کے قدِ آدم آئینے میں ایک برہنہ عورت اُسے گھور رہی تھی۔ اُس کے جسم پر لباس کا ایک تار بھی نہ تھا۔ اُس کے قریب ہی ایک شخص صرف بنیان پہنے سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ تڑپ کر اُٹھی اور احمد بخش کی بنیان پکڑ کر پوری قوت سے کھینچی! احمد بخش خوفزدہ ہو گیا۔ ایک ہی جھٹکے میں پھٹ کر بنیان اُس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے احمد بخش کا منہ نوچ لیا اور اُس کے گلے اور سینے پر ناخنوں سے خراشیں ڈال دیں۔ اُس کے چہرے اور جسم سے خون رسنے لگا۔

"کتے۔ کمینے۔ حرامی"

"بائی جی۔ ہم اچھا آدمی ہے سلیم اپن کا دوست ہے" کتا، کمینہ، حرامی بولا

"سلیم" منیرہ پوری قوت سے دوبارہ چیخی۔ اُس کی آواز کمرے میں گونج گئی۔ مگر سلیم کہیں سے نہ آیا۔ وہ مادر زاد برہنہ احمد بخش کے ساتھ اس کمرے میں رات گزار چکی تھی یہ ایک حقیقت تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اماں بی تم کیوں مر گئیں، میں آخر کیوں نہ مر گئی۔ کاش تمہاری دعائیں ہی قبول ہو جاتیں میں بھیڑیوں میں تنہا تو نہ ہوتی"۔ اس نے اپنی برہنگی چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی بس روتی رہی۔

"ہم سلیم کو ایک ہجار روپیہ دیا۔ تم کو ہجار اور دے گا مگر تم شور نہ کرو۔ روتی کیوں ہو۔ سلیم لولا۔ مان جائے گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دیکھو ہم اجت دار آدمی ہے، پھڈا کاہے کو کرتی ہے، ہوٹل کا معاملہ ہے، پولیس تم کو بھی پکڑلے گی"۔

احمد بخش دیر تک اُسے سمجھاتا رہا۔

منیرہ مکان میں داخل ہوئی تو سلیم اُسے نظر نہ آیا۔ خالو جان بھی ابھی تک نہ آئے تھے۔ اُس کی مٹھی میں احمد بخش کے دیئے ہوئے ہزار روپے موجود تھے۔ اُس نے یہ نوٹ سلیم کے ہینگر پر ٹنگے ہوئے کوٹ کی جیب میں ٹھونس دیئے۔ دل کا جوالا مکھی پھوٹ بہا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا۔ کپڑے اُلٹے سیدھے اٹیچی کیس میں ڈالے۔ کمرے پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور جلدی صحن میں شرقی و غربی دیواروں میں بندھے ہوئے تار پر طوطے کا خالی پنجرہ ہوا سے جھول رہا تھا۔ طوطا کہیں نہ تھا۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور مکان سے باہر نکل گئی۔ منیرہ تنہا نہیں جا رہی تھی مجبوری اور گناہ اُس کے آگے آگے چل رہے تھے۔

منیرہ کو ہسپتال کے میٹرنٹی وارڈ میں کام کرتے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔ خالہ جان کے مکان سے نکل کر ہسپتال کے ہوسٹل میں آگئی تھی اور ہوسٹل کے باہر کی زندگی سے اُس نے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا۔ اُس نے پھر سلیم یا خالو جان کو نہ دیکھا تھا۔ مردوں کی صورت سے اُسے نفرت ہو گئی تھی، اُسے ہر مرد یا سلیم نظر آتا یا احمد بخش۔

ہسپتال میں رہتے ہوئے منیرہ نے اپنے ماضی کے زخموں کے اندمال کی کوشش کی تھی۔ اُس نے سب کچھ بھول جانا چاہا تھا۔ لیکن یادوں کے ناسور رستے ہی رہے۔ کبھی اُسے سلیم کے کردار اور اپنے بھولپن پر حیرت ہوتی کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا اور خود کو ملامت کرتی۔ سلیم جو ماں سے بہن کے لئے دوا کے پیسے لے کر گھر سے نکلتا اور گئی رات کو انہی پیسوں سے شراب پی کر گھر آجاتا۔ جسے ماں برسات کے دنوں میں کمرے پر چھت ڈالنے کے لئے ٹین کی شیٹ کے پیسے دیتی اور وہ رات کو جھگتا ہوا شراب کے نشے میں دھت آتا تو ماں اور بھائی بہنوں کو ٹین کی شیٹ کے انتظا

میں بارش میں بھیگتا ہوا دیکھ کر اول فول بکنے لگتا اور چھوٹے بہن بھائی رات بھر بھیگ کر بھی بڑے بھائی سے شکوہ نہ کرتے۔ بہن بیمار رہ کر مر گئی اور بھائی تعلیم نہ حاصل کر سکا اور ایک دن گھر سے ایسا گیا کہ پھر نہ لوٹا۔ خالہ جان نے یہ سب واقعات منیرہ کو ایک ایک کر کے سنائے تھے مگر نہ جانے کیوں منیرہ سلیم سے نفرت نہ کر سکی حتیٰ کہ اب ہسپتال میں رہتے ہوئے سلیم اُسے دنیا کا سب سے زیادہ قابل نفرت شخص محسوس ہوتا تھا۔ وہ تنہائی اور بیگانگی کے جہنم میں جلتی رہی لیکن اُسے سلیم اور خالو جان کو دیکھنے کی خواہش بھی نہ ہوئی۔ وہ ہسپتال میں ایک طرح کا سکون محسوس کرتی تھی۔ وہ خود کسی کی نہیں تھی نہ کوئی اُس کا تھا۔ اُس نے کبھی کسی سے خلوص کا مظاہرہ نہ کیا تھا نہ کسی نے اُس سے غمگساری کی تھی۔ لیکن عین تنہائی اور اجنبیت کے زمانے میں پرانے ڈاکٹر کے ریٹائر ہونے پر ہسپتال کا چارج ڈاکٹر اختر نے لیا۔

ڈاکٹر اختر چارج لیتے ہی منیرہ پر مہربان ہو گیا۔ اُس نے منیرہ کی ترقی کی سفارش کی اور اُسے وارڈ کا انچارج مقرر کر دیا اور منیرہ پر کوئی احسان نہ جتایا۔ منیرہ ڈاکٹر اختر کی عنایتوں کو شک کی نظروں سے دیکھتی رہی لیکن اُس نے منیرہ سے کچھ کہے بغیر اُس کا ہر طرح خیال رکھا۔ اُس پر حد درجہ مہربان رہا اخلاق سے پیش آیا اور اُس کی عزت کرتا رہا۔ بالآخر منیرہ کے دل میں چھپی ہوئی مردوں سے نفرت کم ہوتی گئی اور ڈاکٹر اختر اُسے عام مردوں سے مختلف لگا اور اُسے ڈاکٹر اختر سے ایک طرح کا اُنس ہو گیا۔

ایک شام جنرل راؤنڈ کے بعد ڈاکٹر اختر منیرہ کو لئے ہوئے ویران گیلری کے پرے تک چلا گیا۔ گیلری میں حبس ہو رہا تھا۔ باہر سڑک پر شام کے سائے لانبے ہو رہے تھے مریض لان میں ہوا خوری کر رہے تھے۔

"مس منیرہ۔ تم اِس قدر اُداس اور سنجیدہ دکھائی دیتی کہ مجھے ہول ہونے لگتا ہے۔"

منیرہ خاموش رہی۔ اُس نے سوچا اب وہ اَن کہی بات ڈاکٹر اختر کے منہ سے نکلنے ہی والی ہے۔ پھر کیا ہو گا۔ ڈاکٹر اختر بھی اُس کی نظروں سے گر جائے گا۔

"اگر کوئی تکلیف ہے تو مجھے بتاؤ میں اِس ہسپتال کا انچارج ہی نہیں انسان بھی ہوں تمہارا دوست بھی ہوں، بے تکلف کہہ ڈالو۔" ڈاکٹر نے کہا

"دوست" منیرہ نے سوچا۔ کاش ڈاکٹر اختر دوسرے مردوں سے مختلف ہو۔

"تھینک یو۔ ڈاکٹر" منیرہ نے کہا

"کیوں اس قدر افسردہ ہو"

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں"۔ اس نے ڈرتے ڈرتے مسکراتے کی کوشش کی۔

"تمہارے ماں، باپ کہاں ہیں"۔ ڈاکٹر نے سوال کیا۔

چھن سے وارڈ میں کسی مریض کے ہاتھ سے شیشے کا کوئی برتن گر کر ٹوٹ گیا۔ منیرہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

ڈاکٹر اختر منیرہ کا ہاتھ پکڑ کر ہسپتال کے مشرقی سرے پر اُسے اپنے بنگلے میں لے گیا اور منیرہ کی گھنٹوں دلجوئی کرتا رہا۔ رات گئے جب منیرہ اپنے کمرے میں واپس آئی تو اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اب تنہا نہیں ہے۔ اُس کے اندر حوصلہ اور قوت آ گئی ہو۔ اُس نے کئی سالوں کے بعد آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ وہ اپنے آپ کو پہچان نہ سکی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اُسے بہت بُرے لگے۔

صبح جب وہ ہوسٹل سے وارڈ کی طرف جانے لگی تو لان سے گزرتے ہوئے اُس نے سرخ گلاب اپنی سفید یونی فارم کے بٹن ہول میں لگا لیا۔

منیرہ ڈاکٹر اختر سے متاثر ہوتی گئی اور اُس کا فالتو وقت ڈاکٹر اختر کے ساتھ گزرنے لگا دونوں گھنٹوں مختلف موضوع پر گفتگو کرتے رہتے۔ منیرہ جتنا وقت ڈاکٹر کے ساتھ گزارتی اُتنا ہی زیادہ اُس کے قریب ہوتی چلی جاتی۔ اُس نے کبھی منیرہ سے براہ راست دل کی بات نہ کہی لیکن جب بھی ذاتی پسند اور ناپسند کی بات آتی تو منیرہ کو محسوس ہوتا کہ اُس کی ذات میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ڈاکٹر اختر کا معیار ہیں۔

ڈاکٹر اختر اُس سے کہتا:

"مس منیرہ! مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے یہ بھول جایا کرو کہ تم لڑکی ہو اور ہمارے درمیان مراتب کی دیوار حائل ہے۔ اگر اختلاف رائے ہو تو تم کھل کر اظہار کرو تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ تمہاری اپنی بھی کوئی رائے ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے کس طرح کی بیوی چاہیئے۔ وہ تمام خصوصیات تمہاری ذات

میں موجود ہیں لیکن کبھی اختلاف رائے بھی ضروری ہے۔ اسی لئے میرے خیال میں شادی سے قبل ہمارا دوستوں کی طرح رہنا اور ملنا جلنا بے حد ضروری ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مزاج اور عادتوں کو اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ شادی کے بعد کوئی پچھتاوا نہ ہو۔ وہ بیوی کیا جو اپنے شوہر کی ہر معاملے میں شریک نہ ہو، مجھے چھوئی موئی سی، بات بات پر شرما کر گردن جھکا لینے والی لڑکیاں کبھی پسند نہ آئیں۔ میں ڈرنک کرتا ہوں، اگر تم میرے ساتھ شریک نہ ہو سکو تو مجھے لازماً کوئی اور پارٹنر تلاش کرنا پڑے گا۔ تم مجھے اس کا موقع ہی نہ دو۔ جب میں خود ڈرنک کرتا ہوں تو میری بیوی کو بھی میرے ساتھ شریک ہونا پڑے گا۔ جب ہمارے بچے ہوں گے ہم اسموکنگ بھی چھوڑ دیں گے"۔

منیرہ نے ڈاکٹر اختر کے ساتھ پینی شروع کر دی۔

حسب معمول ایک رات وہ ڈاکٹر اختر کے بنگلے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ رات زیادہ گزر چکی تھی سارے ملازم جا چکے تھے۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے طوفان در و دیوار اکھاڑ پھینکے گا۔ صرف بارش کی آواز اور ہواؤں کا شور سنائی دے رہا تھا اور کوئی آواز نہ تھی۔ بجلی فیل ہو چکی تھی اور وہ دونوں موم بتی کی روشنی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے میز پر چیری کی کھلی ہوئی بوتل رکھی ہوئی تھی اور دونوں چسکیاں لیتے ہوئے باتوں میں مشغول تھے۔

آسمان پر بجلیاں کوند رہی تھیں اور بادل گرج رہے تھے۔

باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔

دریچوں میں ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی اور کوئی آواز نہ تھی

کمرے میں موم بتی کی روشنی میں سائے لرز رہے تھے۔

چیری نے جسموں میں آگ بھر دی تھی۔

ڈاکٹر اور منیرہ ایک دوسرے کو دیکھتے اور مسکرا دیتے۔

ڈاکٹر اختر مسکراتا ہوا کرسی سے اٹھا الماری کھولی اور گولیوں کا پیکٹ منیرہ کی گود میں ڈال دیا۔ منیرہ نے پیکٹ پر ہفتے کے دن لکھے ہوئے دیکھے اور ڈاکٹر اختر کا منہ دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر اختر کے چہرے پر مسکراہٹ جم سی گئی تھی۔

رات زیادہ گزر چکی تھی۔ بارش جاری تھی۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ چیری نے جسموں میں

آگ بھر دی تھی۔ اُس نے گولیوں کا پیکٹ پہچان لیا منیرہ نے آہستہ آہستہ پیکٹ کھولا۔ مڑ کر دیوار پر لگے ہوئے کلنڈر میں دن دیکھا اور پیکٹ پر اُسی دن کے خانے سے گولی نکال کر کھالی۔

آج ایک ماہ بعد جب ڈاکٹر نے گولیوں کا تازہ پیکٹ اُس کی گود میں ڈالا تو منیرہ تڑپ گئی۔

سگریٹ کا گُل ایش ٹرے سے پھسل کر میز پر گرا اور پنکھے کی ہلکی ہوا سے لڑھک کر عنابی قالین پر پھیل گیا۔ اُس کی انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ سلگ رہی تھی اور اُس نے ڈاکٹر اختر سے کہا تھا۔

"تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ میں LIVING TOGETHER ٹائپ نہیں ہوں۔ آخر ہم یہ گناہ آلود زندگی کب تک گزارتے رہیں گے۔ کیا کسی وقت تمہارا CONSIOUS تم سے کوئی تعرض نہیں کرتا یہ وعدوں پر وعدے آج اور کل، ابھی نہیں بعد میں یہ سب کیا ہے۔ محبت ایک مقدس جذبہ ہے اور شادی ایک مقدس رشتہ۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے میں جانتی ہوں، مجھے اس کا یقین ہے لیکن میں اپنا گھر اپنے بچے اور اپنا شوہر چاہتی ہوں I WANT TO POSSES THEM ۔ میں تمہارے بچوں کی ماں کہلانا چاہتی ہوں۔ ذرا سوچو ڈاکٹر HOW EXCITING ۔"

اور ڈاکٹر نے کہا تھا۔ آج شام وارڈ میں بات کروں گا۔ وہ پتھر کی بنچ پر بیٹھی ہوئی ڈاکٹر اختر کے جواب کی منتظر تھی۔ شبنم سے اسکے کپڑے بھیگ چکے تھے لان کے سرے پر ڈاکٹر اختر کی ریذیڈنٹ مذدا کھڑی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پتھر کی بنچ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ سامنے وارڈ میں ۱۳ نمبر بیڈ کے پیشنٹ کے ساتھ والی لڑکی بے سُدھ پڑی سو رہی تھی۔

میٹرنٹی وارڈ سے کسی بچے کے رونے کی آواز نے اُسے چونکا دیا اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ ایک ٹیس سی اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میرا گھر، میرا شوہر، میرا بچہ۔

سامنے کے وارڈ سے ڈاکٹر اختر نکلا اور ریذیڈنٹ مذدا کی طرف چلدیا۔ منیرہ سامنے کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اُسے دیکھا اور اُس کے قدم وہیں جم گئے وہ آہستہ آہستہ ڈاکٹر اختر کے قریب گئی۔

میں تمہارا انتظار کر رہی تھی ڈاکٹر" منیرہ نے کہا

"منیرہ تم اب تک سوئیں نہیں کیا۔"

"میری بات کا جواب دو ۔ شاید میں اب تک سوتی ہی رہی ہوں"۔

ڈاکٹر اختر نے اپنے الفاظ دل میں تو لے اور ہوا میں اچھال دیئے۔

"منیرہ میں ری کنڈیشنڈ کار رکھ سکتا ہوں اور کچھ نہیں"۔

ڈاکٹر اختر کا جملہ سن سے تیر کی طرح منیرہ کے دل میں پیوست ہو گیا۔

ری کنڈیشنڈ مزدا اسٹارٹ ہوئی اور ڈاکٹر اختر چلا گیا۔ میٹرنٹی وارڈ میں روتے ہوئے بچے کی آواز کار کی آواز میں ایک ثانئے کے لئے ڈوب گئی۔ کار چلی گئی اور بچے کے رونے کی آواز واضح اور تیز ہوتی گئی۔ منیرہ اپنے کمرے میں گئی آئینے کے سامنے اپنا جائزہ لیا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھے۔ اپنے ہونٹوں سے لپ اسٹک صاف کی۔ سفید بالوں کی لٹ جو ہمیشہ کنگھا کرتے ہوئے سیاہ بالوں کے نیچے دبا دیا کرتی تھی کھول کر پیشانی پر ڈال لی۔

آئینے کے سامنے کھڑے کھڑے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"میں ماں نظر آتی ہوں نا"۔

منیرہ میٹرنٹی وارڈ میں گئی اور جا کر روتے ہوئے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

○

دراڑوں میں سانپ

"پاپا آپ کہاں پیدا ہوئے تھے"؟
اُس نے سوال کرنے والے کی طرف دیکھا۔ یہ اُس کا بیٹا تھا جمیل سامنے کھڑا اُس کے جواب کا منتظر تھا۔ اُسے اپنا بیٹا بڑا اجنبی سا لگا۔ جیسے اُس نے ایک بے ضرر سا سوال نہ کیا ہو اُسے کوئی گندی سی گالی دے دی ہو۔ لیکن جمیل کے چہرے پہ تو ہمیشہ جیسی معصومیت اور نرمی تھی۔
"کہاں —— پاپا آپ کہاں پیدا ہوئے تھے"؟ جمیل نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ اور سن سے دوسرا تیر اُس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔
"میں کہاں پیدا ہوا تھا؟" اُس نے بڑے کرب سے سوچا میں کہاں پیدا ہوا تھا؟ ۔ یہ سوال گذشتہ اکتیس ۳۱ سالوں میں اُس سے اتنی دفعہ پوچھا گیا تھا کہ اُسے اب اس سوال سے اُبکائی آنے لگی تھی۔ سوال سنتے ہی اُسے ایسا لگتا کہ اُس کے پیٹ میں کنڈلی مارے بیٹھا ہوا سانپ آہستہ آہستہ کنڈلی کھولنے لگا ہو۔ جوں جوں

گردن سے لے کر دم تک کے دائرے کھلتے کنڈلی کا وجود ختم ہوتا جاتا وہ کرب سے بے دم ہوتا جاتا اور اُس کے پیٹ سے بگولے اُٹھ اُٹھ کر اُس کے حلق میں پھنستے جاتے۔ اور اُسے شدید ڈپریشن ہونے لگتی۔

شروع میں اس سوال پر وہ اس لئے خفا نہ ہوتا تھا کہ شاید لوگ اسے زیادہ قریب سے جاننے کے لئے یا اجنبیت ختم کرنے کے لئے یہ سوال کرتے ہوں گے۔ لیکن کچھ ہی سالوں میں اُسے یقین ہو گیا کہ یہ سوال گفتگو کو آگے بڑھانے کے لئے لازمی سمجھا جانے لگا ہے تو اُسے اس سوال سے نفرت ہو گئی۔

"وہ کہاں پیدا ہوا تھا؟" اُس لمحے اُس نے اپنے آپ سے اکتیس[۳۱] سال بعد سنجیدگی سے سوال کیا۔ اتنی سنجیدگی سے کہ اُس کی پیشانی کی نسیں اُبھر آئیں، تنفس تیز ہو گیا۔ اور آنکھوں کے سامنے رنگین دائرے سے ناچنے لگے۔ پھر یہ دائرے پھیلنے شروع ہوئے اور پھیلتے پھیلتے ایک تالاب میں بدل گئے جس کا گدلا پانی ہمیشہ کائی سے ڈھکا رہتا اور بند پانی میں چھوٹے چھوٹے دائرے بنتے بگڑتے رہتے پھر ننگ دھڑنگ چھوکرے اپنی ہوم میڈ بنسیاں لے کر مچھلیاں پکڑنے آجاتے اور چھوٹی چھوٹی چمکدار مچھلیاں بنسی کے کانٹوں میں پھنسی ہوئی باہر آجاتیں۔ وہ ان چھوٹی چھوٹی تڑپتی ہوئی زندہ مچھلیوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتا۔ اسے اُن مچھلیوں کی آنکھوں میں انتظار اور اُمید دکھائی دیا کرتی تھی۔

"آخر ان چھوٹی مچھلیوں کو بڑی مچھلیاں کیوں نہیں کھا جاتیں جو یہ بنسیوں کے کانٹوں میں پھنسی ہوئی باہر آجاتی ہیں۔" وہ ہمیشہ سوچا کرتا۔

"شاید اس تالاب میں بڑی مچھلیاں نہ ہوں گی۔" وہ خود ہی سوچتا۔

"یا شاید اس تالاب کی بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نہ کھاتی ہوں گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" ——— وہ مطمئن ہو جاتا۔

تالاب کے کنارے کنارے دور تک گاؤں کی آبادی پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں کے وسطی حصے میں تالاب کے ساتھ ہی سرخ اینٹوں والی عمارت میں گاؤں کا واحد

پرائمری اسکول تھا۔ برسات کے دنوں میں جب تالاب پھیلتا اور بڑھتا تو اسکول کی سرخ اینٹوں والی دیوار آدھی اونچائی تک پانی میں ڈوب جاتی اور جب آہستہ آہستہ پانی اُترتا تو آدھی ہی اونچائی تک دیوار کائی سے سبز ہو جاتی اور کائی لگی دیوار کی دراڑوں سے سانپ جھانکنے لگتے۔

اُسے بزرگوں نے بتایا تھا کہ یہ پانی کے بے ضرر سانپ ہیں ان میں زہر نہیں ہوتا۔ اُسے بزرگوں کی یہ بات بڑی عجیب سی لگی تھی۔

"بھلا کہیں سانپ بھی بے ضرر ہو سکتے ہیں"۔ اُس کو بزرگوں کی بات کا یقین نہ آیا تھا۔

اسکول کے شرارتی بچے کھانے کی چھٹی میں اسکول کی پچھلی سمت آجاتے اور دور سے سانپوں پر پتھر پھینکتے رہتے۔

اس اسکول میں ٹاٹ کے فرش پر بیٹھ کر اُس نے ملتانی مٹی سے پُتی ہوئی تختی پر پہلا حرف لکھا تھا۔ پہلا سچا انمٹ اور انمول حرف۔ یہیں اُس نے درختوں سے تازہ ٹوٹی ہوئی قمچی کا پہلا نشان اپنے جسم پر دیکھا تھا۔ پہلا سچا انمٹ اور انمول نشان۔ جو مہربان ہاتھوں نے انتہائی نامہربانی سے لگایا تھا۔ اسی اسکول کے صحن میں دوسرے بچّوں کے ساتھ اُس نے صبح صبح اسکول شروع ہونے سے قبل مناجات پڑھی تھی۔

"اے جلّ شانہٗ تو غفور الرحیم ہے"۔

گاؤں کی گلیوں میں اُس نے طرح طرح کے کھیل کھیلے تھے۔ ان گلیوں کی دھول اُس کے انگ انگ میں رچ بس گئی تھی۔ یہاں کے سادہ لوح لوگوں نے اُسے انسانوں سے پیار کرنا سکھایا تھا۔ یہاں اُس نے آم کے باغوں میں محنت کے پھل دیکھے تھے۔ گندم کے کھیتوں میں پسینے کی چمک دیکھی تھی۔ یہاں اس نے رشتوں کا احترام اور جذبوں کا تقدس دیکھا تھا۔ لیکن اچانک اُس نے اُن سب سے منہ موڑ لیا اور اپنی پلکوں پر آنسوؤں کے دیپ جلائے دوسروں کو بلکتا چھوڑ کر منوں بھاری قدموں سے

اپنی بے روح لاش لئے چل دیا اُس نے اصول کے لئے زندگی کا پہلا فیصلہ کن قدم اٹھایا تھا۔ لیکن اس اسکول، تالاب، گلیوں، مناجاتوں، باغوں اور کھیتوں کو نہ بھلا سکا۔ کئی سال تک وہ جتنا بھولنے کی کوشش کرتا یادوں کے دئے زیادہ روشن اور تابناک ہو جاتے اور کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا ہو جاتا کہ مندمل زخم پھر سے ہرے ہو جاتے اور لَو دینے لگتے۔ ٹیسیں اسے پہروں تڑپاتی رہتیں۔ لیکن پھر اُس نے چیزوں، واقعات اور رشتوں کو بھول جانا سیکھ لیا اور اپنی پہچان گم کر دی۔ وہ اُن چھوٹی مچھلیوں کو بھی بھول گیا جنہیں بڑی مچھلیاں جانے کیوں نہ کھاتی تھیں اُن سانپوں کو بھی بھول گیا جو بے ضرر تھے اور جن میں زہر نہ تھا۔

سب کچھ بھول گیا۔

اکتیس سال بعد اُس کا اپنا بیٹا اپنے تیز ناخنوں سے اس کے مندمل زخم کرید رہا تھا اور زخموں سے ہوے ہوے خون رسنے لگا تھا۔ اُس نے اپنے ظالم بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ محوِ حیرت کھڑا ہوا تھا۔

"پاپا۔ آپ کی جائے پیدائش"۔ اس کے بیٹے جمیل نے پھر سوال کیا۔

"بیٹے تم اتنے سرکش، ظالم اور بے حس ہو کہ تمہیں میری اذیت کا کوئی احساس نہیں ہے۔ مجھ پہ کیا بیت رہی ہے تم محسوس تک نہیں کرتے"۔ اُس نے بڑے کرب لیکن رسان۔ سے اپنے بیٹے سے کہا۔

"پاپا مگر مجھے تو یہ فارم پُر کرنا ہے۔ جس میں میری اور میرے باپ کی جائے پیدائش پوچھی گئی ہے"۔

"مگر فارم تو تمہارا ہے۔ میری جائے پیدائش سے کیا تعلق"۔

"وہ پوچھتے ہیں۔ یہ دیکھئے یہ لکھا ہوا ہے"۔ جمیل نے فارم باپ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تو اس میں لکھ دو کہ میرا باپ مر چکا ہے اور اُس نے مجھے اپنی جائے پیدائش نہیں بتائی"۔

برتھ ڈے کیک

آج لی یم کی سالگرہ ہے۔

میں اُسے کوئی تحفہ دوں گا اور وہ اُسے قبول کرے گی۔ شکریہ کا ایک بھی لفظ بولے بغیر۔ چپ چاپ۔ پھر اُس تحفے کا ذکر کبھی کسی کی زبان پر نہ آئے گا۔ نہ پسند کا نہ ناپسند کا۔ نہ قیمتی ہونے کا نہ کم قیمت ہونے کا۔ ہمارے درمیان اِس طرح کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ ہم ہمیشہ یہ جان لیتے ہیں کہ ہم میں سے کس نے کب کیا سوچا ہوگا۔ کسی چیز، واقعہ یا بات کا کس پہ کیا ردعمل ہوگا۔ ہم چیزوں کو ایک طرح پسند کرتے ہیں یا ناپسند کرتے ہیں۔ قبول کرتے ہیں یا رد کر دیتے ہیں۔ ہمیں لوگ ایک ساتھ پسند آتے ہیں اور اُن سے ہمیں کسی بات پہ ایک ساتھ اختلاف ہو جاتا ہے۔ ذہنوں کی یہ ہم آہنگی بہت ہی کم عرصے میں پیدا ہوئی ہے۔

لی یم سے میری ملاقات اُس وقت ہوئی تھی جب وہ اپنے شوہر کی بے وفائی سے ٹوٹ کر بکھر چکی تھی اور مسلسل اعصابی کشیدگی کی وجہ سے بات بات پر جھگڑنے

اور رونے لگتی تھی۔ ہوٹل میں دوپہر کے کھانے پر میرے ایک شناسا نے مجھے اُس سے متعارف کرادیا۔ کھانے کے دوران خاموشی رہی لیکن سبز چائے پیتے ہوئے آہستہ آہستہ گفتگو شروع ہوئی اور مختلف موضوع زیربحث آتے چلے گئے۔ وہ روانی سے انگریزی بول رہی تھی اور ہر شے کے بارے میں اپنا ایک محکم نظریہ رکھتی تھی ہوٹل کی ملاقات کے بعد پھر میں کئی دنوں اُس سے نہ مل سکا۔ مگر اُس ملاقات کا نقش میرے ذہن پر اتنا گہرا تھا کہ میں اُس سے دوبارہ ملنا چاہتا تھا۔ اُس کا بات کرنے کا جارحانہ لہجہ اور اُس کا اسٹائل منفرد تھا اور وہ عام عورتوں سے کئی اعتبار سے مختلف لیکن خوبصورت عورت تھی۔ شاید میں اسے پسند کرنے لگا تھا۔ ہوٹل کی ملاقات کے بعد ہر لمحے میرے ذہن میں اُس کی آواز گونجتی رہتی اور نگاہوں کے سامنے اُس کا سایہ متحرک رہتا کبھی دھندلا کبھی واضح مکمل اور بھرپور جیسے وہ ہر لمحہ میرے ساتھ ہو۔

اس کا چھوٹا سا ڈرائنگ روم سادہ فرنیچر سے آراستہ تھا۔ دیوار پر ایک دو خوبصورت پینٹنگ اور فرش پر چھوٹا سا قالین کمرے کی سادگی اور حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔ ہمارے علاوہ ڈرائنگ روم میں اور کوئی نہ تھا۔

ہم سنبھل سنبھل کر محتاط انداز میں بے حد رسمی گفتگو کر رہے تھے۔ اُس دن میں نے صبح ہی صبح ٹیلیفون پر ملنے کی اجازت چاہی تھی اور اُس نے بڑی فراخدلی سے مجھے بلالیا تھا مگر اُس وقت جبکہ میں اس کے ڈرائنگ روم میں تھا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے اپنے آنے کا کوئی نہ کوئی جواز تیار رکھنا چاہئے کہ اگر وہ آنے کا سبب پوچھ ہی لے تو میں اُسے مطمئن کر سکوں لیکن میرے ذہن میں کوئی بے ضرر سا بھی جھوٹ نہ آسکا۔ شاید لی یم کے سامنے میں جھوٹ نہ بولنا چاہتا تھا خواہ وہ کتنا ہی بے ضرر کیوں نہ ہو اور میں نے فیصلہ کیا کہ اگر لی یم نے آنے کا سبب پوچھا تو میں اُسے بتادوں گا کہ میں اُسے دیکھے بنا بے چین تھا۔ لیکن لی یم نے میری بے چینی شاید محسوس کرلی تھی۔ اُس نے کچھ پوچھا ہی نہیں کیوں کہ میرا جواب ہم دونوں کے دلوں میں دھڑک رہا تھا۔

"آپ ایک منٹ بیٹھئے۔ میں چائے لاتی ہوں۔" اُس نے کہا اور اس طرح بھاگ کر باورچی خانے کی طرف گئی جیسے کوئی ننھی سی بچّی اپنی گڑیا کسی کو دکھانے کے لئے لینے جاتی ہے۔

اُس کی گفتگو، لباس، رہن سہن اور اٹھنے بیٹھنے میں ایک طرح کا بانکپن تھا۔ سب سے الگ، سب سے منفرد اور دل نشین۔

ایک ہی منٹ میں لی یم چائے لے کر آ گئی اور مسکرا کر مجھ سے چینی کی مقدار معلوم کی۔ کمرے کا ٹینشن ختم ہو گیا اجنبیت جاتی رہی اور چائے پیتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے کسی دوست سے بچپن میں بچھڑ گیا تھا اور وہ کئی سالوں بعد کہیں دور دراز سے مجھے تلاش کرتا ہوا میرے پاس آ گیا ہو اور اب سالہا سال کی مدت اور دور دراز کے فاصلوں کی وجہ سے ہم اتنے بدل گئے ہوں کہ بچپن کی رفاقت کی کوئی چنگاری یا روشنی نظر نہ آتی ہو اور ہم اس روشنی کی تلاش میں ہوں جس نے ہمارے دلوں میں بچپن کی محبت کو زندہ رکھا تھا۔

میں ہمیشہ ہمیشہ سے تنہائی کا زہر پی رہی تھی۔

طویل بوجھل اور ڈراؤنی راتیں۔

سرد ویران ٹھہرے ہوئے دن۔

راستے جن پر اجنبیت کے حشرات الارض رینگ رہے تھے۔

اور تنہائی کا زہر۔

پھر اچانک صبح کے تارے کی طرح وہ مجھے دور اور ناممکن سا نظر آیا۔

سورج کی پہلی کرن کی طرح روشن اور کومل۔

اُس نے مجھے پہچان لیا۔

وہ امرت تھا تنہائی کا زہر کٹ گیا۔

لی یم یوں بول رہی تھی جیسے کسی گیت کے بول دہرا رہی ہو۔

اُس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے جیسے گلاب کی پنکھڑیاں ہوا سے کانپ

رہی ہوں۔ اُس کی آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی جیسے کہیں پوجا کا گیت گایا جا رہا ہو۔

جانے پھر کیا ہوا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے بولتے بولتے رک کر میری طرف غور سے دیکھا۔ آنسوؤں کے بارے میں کچھ نہ بولی۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ"۔ لی یم نے پوچھا۔

"کون تھا وہ"؟ میں نے سوال کیا۔

"بڑے جلد باز ہیں آپ"

"یوں ہی خیال آ گیا کہ پوچھ لوں"۔

"میں اور چائے لاتی ہوں"۔

وہ دوبارہ چائے لے آئی۔ ہم دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ مجھے خیال آیا کہ اب چلنا چاہئے۔ چائے پی کر میں نے اجازت چاہی۔ وہ مجھے دروازے تک رخصت کرنے آئی تو میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا وہ منہ سے کچھ نہ بولی صرف مسکرا دی۔

"پھر کب آؤ گے"۔ لی یم نے اچانک پوچھا۔

یہ ایک سوال ہی نہیں تھا دلوں سے پھوٹنے والی اپنائیت کی روشنی تھی جسے ہم گذرے ہوئے لمحوں میں تلاش کر رہے تھے کہ اچانک وہ روشنی ہمیں مل گئی۔

"آؤں گا۔ ایک دو روز میں"۔

"آنا"

"خدا حافظ"

"خدا حافظ"

بڑے بدھ کے سائے میں لی یم نے ایک روز مجھے بتایا۔

"مجھے بدھا سے شانتی اور شکتی ملتی ہے"۔

میں پتھر کے عظیم الشان مجسمے کو دیکھنے میں محو تھا۔

"تم کو شانتی اور شکتی کس سے ملتی ہے" لی یم نے سوال کیا۔

"کسی مجسمے یا مورتی سے نہیں ملتی۔"

"پھر کس طرح ملتی ہے"۔

"میں نے کبھی غور نہیں کیا"۔

"غور سے دیکھو شہزادہ سدارتھ کے چہرے پر کیسی شانتی ہے"۔

"وہ تو ہے"۔

"تمہیں یہاں آکر سکون نہیں ملا"۔

"ملا"

"ہو گئے نا قائل تمہیں یہاں آکر سکون ملتا ہے"۔

"وہ تو تمہاری وجہ سے ملتا ہے"۔

"کیا — ARE YOU IN SENSES" وہ تیکھے پن سے بولی۔

"بالکل نارمل ہوں" میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"OF COURSE NOT" وہ اسی طرح بولی۔

اور ہم دونوں نے بھر پور قہقہہ لگایا اور عین بدھا کے مجسمے کے سائے میں ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور مجسمے کی طرح ساکت اور سنجیدہ ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکن سنتے رہے۔

"تم بدھ مت کی ماننے والی ہو نا" میں نے لی یم سے سوال کیا۔

"انسانیت محبت اور سچائی میرا مذہب ہے"۔

ہم اُن کھنڈرات کی طرف چلے جا رہے تھے جو ابھی نئے دریافت ہوئے تھے اور فضا میں پتھروں اور لوہے کی بو تھی۔ ہم ناہموار راستے پر آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

"تم تو بدھا کی عقیدتمند ہو نا"۔

"بدھا کا تو ہر وہ شخص جو سچائی، انسانیت اور محبت پر یقین رکھتا ہے معتقد ہو گا ——— کیا تم سچائی، انسانیت اور محبّت پر یقین نہیں رکھتے؟"

"پھر بھی سچائی، محبت اور انسانیت کے اس مذہب کو تم نے کیا نام دیا ہے؟"

"میرا اپنا مذہب ہے۔ بس۔ اُس کا کوئی نام نہیں"۔ لی یم نے بڑے جوش میں کہا۔

"مَیں نے جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ کر رہی ہوں دنیا اور دنیا کے مذہب کی نظر میں چاہے کتنا ہی برا کیوں نہ ہو مگر میں خدا سے اپنے ہر عمل کا حساب کر لوں گی۔ مَیں اپنے ہر عمل میں حق بجانب ہوں۔ خدا کو میرا نقطۂ نظر سمجھنا ہو گا۔"

میں اُس کی تقریر سے بالکل متاثر نہ ہو سکا۔ پھر بھی میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ بول جو اتنے جوش اور یقین سے رہی تھی۔ اس کے علاوہ یہ اُس کا اور اُس کے خدا کا معاملہ تھا۔

"تم نہیں جانتے۔ میں نے اُسے جب وہ کچھ نہ تھا سہارا دیا۔ اُس کی دلجوئی کی۔ میں سمجھتی تھی میں اُسے رفاقت اور پیار دے رہی ہوں۔ میری نظر میں وہ اس وقت اُس کا مستحق بھی تھا۔ لیکن جانے کیسے سب کچھ گڈ مڈ ہو گیا اور پیار اور رفاقت سب کچھ بے معنی ہو گئے اور میرے گرد جیسے خالی برتن کھڑکھڑانے لگے۔ ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جن کا کوئی مفہوم ہی نہ ہوتا تھا۔ ہر چیز سے سچائی جیسے کشید کر لی گئی ہو۔ ایک آفاقی تجریدیت سارے میں اتر آئی اور ہر گھڑی ایک سانحہ بنتی چلی گئی میرے ارد گرد دھماکے ہونے لگے۔"

میں اُس کی طرف بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے خوبصورت ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"میں نے بہترین بیوی کی طرح اُسے اطاعت دی، اُس کے بچّوں کی ایک عمدہ ماں کی طرح حفاظت کی اور انہیں تربیت دی۔ لیکن مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ جب

ذہنی رفاقت اور جسمانی ہم آہنگی کا میرے ذہن میں تصور تھا وہ مجھے نہیں ملی۔ مجھے ایسا لگا جیسے ابتدا سے انتہا تک سب کہیں کھوٹ تھا۔ اب جبکہ میں شباب پیچھے چھوڑ آئی ہوں اُس کے بچّوں کی ماں بن چکی ہوں اور اُس کے پیسوں پر گھر چلاتی ہوں وہ مجھے چیٹ (CHEAT) کر رہا ہے۔ بازاری، آنی جانی عورتوں کو مجھ پر ترجیح دے رہا ہے۔"

ہمارے چاروں طرف تازہ کھدائی کے نشان تھے۔ پیروں کے نیچے ناہموار پتھر چلنے میں دشواری پیدا کر رہے تھے مگر لی یم کو کوئی احساس نہ تھا گو کہ وہ اپنے ننھے ننھے بوٹوں کی پتلی پتلی ایڑیوں کی وجہ سے اپنا توازن برقرار رکھنے میں دشواری محسوس کر رہی تھی۔ ناہموار راستہ، جذباتی گفتگو، رندھے ہوئے گلے اور صدیوں پرانے کھنڈرات ـــــ میرے دل میں افسردگی ہر سانس کے ساتھ اُترتی چلی جا رہی تھی۔

"آؤ کہیں بیٹھ جائیں۔" میں نے کہا۔

وہ ایک تازہ کھدے ہوئے تودے کے سائے میں پڑے ہوئے پتھر پر بیٹھ گئی۔

"یہ تودہ ایک طرف جھکا ہوا ہے کہیں گر ہی نہ پڑے کہ دونوں ہی مر جائیں۔" میں نے بیٹھتے بیٹھتے یوں ہی سنجیدہ سا منہ بنا کر کہا۔

"موت سے کیا ڈرنا۔ گرتا ہے تو گر جائے۔ زندگی یوں بھی اچھا خاصا تھکا چکی ہے۔" اُس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"مجھے موت سے کبھی ڈر نہیں لگا۔ جنے کیوں مجھے کسی چیز سے کبھی ڈر لگا ہی نہیں شاید مجھے ڈرنا آتا ہی نہیں۔"

"مگر تودے کے نیچے دب کر مرنا کم از کم مجھے پسند نہیں" مَیں نے کہا۔

"ہونہہ۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ دب کر مرو، کچل کر مرو۔ دوائیں پی کر مرو، ایڑیاں رگڑ کر مرو یا اچانک مر جاؤ۔ جس طرح آئے موت ہی آئے گی کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

ہم دونوں پھر ہنسنے لگے۔

"تم جب مجھے اور دان کو گھر میں ایک ساتھ دیکھو گے تو محسوس بھی نہ کر سکو گے کہ ہم ایک دوسرے سے کتنی دور ہیں۔ مہمانوں کے سامنے ہم ایک۔ دوسرے سے گفتگو بھی کرتے ہیں۔ ایک دوسرے پہ پھبتیاں بھی کستے ہیں، جوکس بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے ہیں۔ پھر جب ہم تنہا ہوتے ہیں تو ہمارے ہونٹ سی جاتے ہیں۔ ہم پتھر ہو جاتے ہیں۔ سرد، بے جان، بے حس، اسٹف، گھٹے گھٹے ایک دوسرے سے بہت دور الگ الگ دو متوازی خطوط کی طرح ایک ہی سمت چلتے ہوئے لیکن دائمی فاصلے لئے ہوئے۔ جب ابھی اتنی زیادہ اندر کی ٹوٹ پھوٹ نہ ہوئی تھی اور وہ میرے ساتھ ہوتا ہم اپنے بیڈ روم میں ہوتے وہ اس لمحے اپنے سڑے بُسے جسم کے ساتھ میرے پاس ہوتا لیکن اس کا آوارہ بیمار ذہن اُن عورتوں کے ساتھ ہوتا جنھیں وہ کسی کافی ہاؤس، پارک یا بار میں چھوڑ آیا تھا۔ اور میں اُس کی یہ کمینگی اور اپنی ذلت چپ چاپ پی جاتی اور تمام اذیت اور کرب محض اُس کی آسودگی کے لئے برداشت کر لیتی کہ میں اس کی نیم پلیٹ (NAME PLATE) کے تحفظ میں ہوں۔"

لی یم تھوڑی دیر خاموش رہی۔ میں بھی کچھ نہ بولا۔

"پھر ہمارے درمیان اپنے آپ تلخیوں کی ناقابل عبور دیوار قلعے کی فصیل کی طرح کھڑی ہوگئی۔ ایسا ہونا ہی تھا۔ جب تک فصیل نہ کھڑی ہوئی تھی کبھی کبھی میں چاہتی کہ میں اُس کے پیٹ پر اس زور کی لات ماروں کہ وہ بلبلانے لگے اور اُسے علم ہو جائے کہ مجھے دو حصّوں میں بٹے ہوئے مرد کی نہیں شوہر کی ضرورت ہے۔ لیکن دان لطیف احساس سے عاری تھا۔ کم از کم میرے لئے۔ پھر لمحے کی کوئی منجنیق اس فصیل کو نہ گرا سکی۔ بلکہ وقت اور حالات کے چھوٹے چھوٹے سنگریزے اُس فصیل کو اور بلند اور زیادہ مضبوط کرتے چلے گئے۔"

"بعض راتوں کو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میں ویرانے میں اُگا ہوا خود رو درخت ہوں، جس کی پتیاں بے رنگ، پھول بے خوشبو اور پھل تلخ ہیں۔ اور

اُس وقت میں ایسی جان لیوا ڈپریشن کا شکار ہوتی ہوں کہ رونا آتا ہے۔ کمرہ بند کر کے چیخ چیخ کے روتی ہوں۔ یہ تنہائی کتنی اذیت ناک ہے کوئی نہیں جانتا۔ میں خدا سے اپنے لئے کیا دعا مانگوں کیا چاہوں کہ میرے شوہر کو میری طرف لوٹا دے اُن تمام غلاظتوں کے ساتھ جو وہ اپنے وجود میں سمیٹتا رہا ہے۔ یا یہ چاہوں کہ میرے جذبات سرد کر دے مجھے یخ کر دے میری خواہشات مجھ سے لے لے —— یہ سڑے گلے سکنڈ ہینڈ شوہر آخر کون ہیں۔ خود جو چاہے کرتے پھریں۔ عورت اگر کسی سے بات کر لے تو عزت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ عزت کیا ہوتی ہے خطرہ کیا ہوتا ہے اگر یہ بات مرد کو معلوم ہے تو عورت بھی جانتی ہے۔ یہ ریسی پروکل بندھن ہے۔ مرد صرف اس لئے آزاد ہے کہ اس کے جسم کی ساخت مختلف ہے —— ایسی تیسی۔ ——"

وہ جملہ نہ پورا کر سکی اور میری طرف دیکھنے لگی۔

"آئی ایم سوری" —— لی یم کھڑی ہو گئی۔

جب میں نے لی یم کو بس پر بٹھایا تو وہ مسکرائی میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر خدا حافظ کہا اور ہم گہرے دوست بن گئے۔

آج لی یم کی سالگرہ ہے۔ میں اُسے تحفہ پیش کروں گا وہ چپ چاپ شکریہ کا ایک لفظ کہے بغیر میرا تحفہ قبول کر لے گی۔

میں کوٹ کی اندرونی جیب میں چھوٹا سا تحفہ لئے اُس کے فلیٹ پر پہنچا۔ سورج غروب ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ زینے پر روشنی تھی اور فلیٹ کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ لی یم اپنے بچوں کے ساتھ موم بتیاں جلائے کیک کاٹنے کے لئے منتظر بیٹھی ہوئی تھی۔ وان وہاں موجود نہ تھا۔

سب گئی رات تک وان کا انتظار کرتے رہے موم بتیاں جل جل کر ختم ہوتی رہیں اور بچے ان کی جگہ نئی موم بتیاں روشن کرتے رہے۔ ٹیپ ریکارڈر پر برتھ ڈے کے نغمے ختم ہوتے رہے اور بچے دوبارہ شروع کرتے رہے۔ پہلے ٹیپ ریکارڈر پر بجنے والے نغموں کا سلسلہ ختم ہوا کسی نے نئے نغمے کی خواہش نہ ظاہر کی پھر جل بجھنے والی موم بتیاں

موم ہوگئیں۔ کسی نے نئی موم بتی روشن نہ کی اور جمائی لیتے ہوئے بچّوں نے ماں کو سالگرہ کی مبارک باد دی اور کیک کی طرف دیکھے بغیر اپنے بستروں پر جا کر سو گئے۔ لی ایم کبھی اخبار پڑھتی اور کبھی زینے کی طرف دیکھنے لگتی۔

نغمے ختم ہوئے۔

موم بتیاں جل بجھیں۔

جب بچّے بھی سو گئے تو میں نے لی یم سے پوچھا وان کیا کہہ گیا تھا۔

"چھوڑو بھی۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے۔"

"پھر بھی کیا اُسے سالگرہ کا پتہ تھا۔"

"مجھے کیا معلوم۔"

"شاید وہ بھول ہی گیا ہو۔"

"اُسے سب کچھ بھول گیا ہے۔ اپنے دوست، آوارہ عورتیں اور شراب یاد ہے۔"

"چلو کیک تو کاٹ لو۔"

"ان تماشوں میں کیا رکھا ہے۔ کیک کٹے یا نہ کٹے میری زندگی تو کٹ گئی میری زندگی کے سارے دن ایک ایک کر کے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے کیا ملا میں اُس کی نیم پلیٹ لگائے اُس کے بچّوں کو پال رہی ہوں۔ میں آخر کیوں اِس طرح گھر کا دروازہ کھول کر اُس کا انتظار کرنے بیٹھ گئی۔ ہاؤ فولش آئی ایم۔"

"اچھا آؤ وان کو تلاش کریں۔"

جب ہم وان کو نائٹ کلب میں شراب کے نشے میں چور ٹیبل گرل کی باہوں میں جھولتا دیکھ کر واپس لوٹ رہے تھے اس وقت رات کے دو بجے تھے میں کار ڈرائیو کر رہا تھا اور لی یم بت کی طرح ساکت بیٹھی ونڈ اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

"کافی پی لو پھر چلے جانا۔" لی یم نے کار سے اُترتے ہوئے کہا۔

"میں نے وان کو تلاش کیا۔ میری تلاش ختم ہوئی۔ اب وان مجھے تلاش کرے۔"

لی یم نے دروازے کا قفل کھولتے ہوئے کہا۔

"روشنی میں بچے ڈسٹرب ہوں گے۔ دوسرے کمرے میں چلو۔" وہ آہستہ سے بولی۔

فلیٹ میں اندھیرا تھا۔ کھڑکی سے آتی ہوئی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا میز پر پڑے ہوئے سفید میز پوش پر کیک اسی طرح رکھا ہوا تھا۔ دوسرے کمرے کی طرف جانے جاتے مجھے ٹھوکر لگی اور میں گرتے گرتے کمرے کے اندر چلا گیا۔

"کیا ہوا" اندھیرے میں لی یم کی آواز آئی۔

"کیک یوں ہی ضائع ہو گیا" میں نے ٹھوکر کی خفت مٹانے کے لئے کہا اور کمرے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں۔ میں لی یم کے بیڈ روم میں کھڑا تھا۔

"اب کیک ضائع نہ ہو گا۔ میں نے وفاداری کا مفہوم سمجھ لیا ہے۔" لی یم نے کہا اور اپنے پیچھے بیڈ روم کا دروازہ بند کر لیا۔

○

میں نے تمہیں اس خوشبو سے پہچان لیا جو
میرے ذہن میں ہمیشہ سے محفوظ ہے تم اپنے ساتھ
وہی خوشبو لائی ہو۔ تم نے بھی پپیتے کی خوشبو، کینو کے
رنگ اور شہد کی مٹھاس سے منہ موڑا ہے۔ تم نے ہیر سیال
کی لے سے جدائی کا گھاؤ سہا ہے۔ تمہارے پاؤں میں
چھالے پڑ گئے ہیں اور ہونٹ خشک ہو گئے ہیں۔

—— لمحے کی صلیب

لمحے کی صلیب

دسمبر کی سرد ویران رات کی برفانی ہوائیں چلتے چلتے تھک گئیں۔ رات کا سفر ختم ہونے کو آیا۔ اُس نے ساری رات اِن بپھری ہوئی ہواؤں کو دریچوں، دروازوں اور خشک پتوں سے ٹکراتے سنا تھا، روشن دانوں اور جھروکوں میں اُن کی شکست خوردہ چیخیں سنی تھیں اور اپنی ناک کی نوک پر اُن کا سرد چبھتا ہوا لمس محسوس کیا تھا اور اس کی ناک کا سرا سُن ہو گیا تھا اور رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں اور آنکھوں میں کنکریاں سی چبھنے لگی تھیں۔ یہ چبھتی ہوئی کنکریاں دسمبر کی سرد رات کی برفانی ہواؤں نے اُس کی آنکھوں میں نہ بھری تھیں۔ نہ روز روز کے رت جگوں نے آنکھوں میں پیڑ ڈالی تھی۔ وہ تو اَن گنت راتوں سے اپنی پلکوں پر کُہر اور برف جیسی ٹھنڈ کا بوجھ لئے اُس کی راہ تک رہی تھی۔

رات کا سفر ختم ہوا مگر وہ نہ آیا۔

پچھم کے اُس پار مخالف سمت سورج نے شب خون مارا کُہر لٹ گئی، شبنم تاراج

ہو گئی۔ برفانی ہواؤں میں مدافعت کی تاب نہ رہی اور اُنہیں پسپائی کا زخم لگا۔ درختوں کے خشک پتے تازہ کمک سے سنبھل گئے۔ فضا میں صلح کا سفید پھریرا لہرانے لگا۔ لیکن برفانی ہواؤں کی پسپائی اور صلح کا سفید پھریرا بھی اُس کی پلکوں سے کہر اور خنکی کا بوجھ نہ اُتار سکے۔ اُس کی آنکھوں پہ پلکوں کا سایہ عنقا ہی رہا۔

پچھلے صدہا دنوں کی طرح تمام دن، دن کا سفر جاری رہا۔ وہ مایوس تھی اُس نے انتظار نہیں کیا پھر بھی پلکیں نہ جھپکیں۔ آنکھیں جوں کی توں کھلی ہی رہیں۔ مگر وہ نہ آیا۔

دن کا سورج زوال کی داستان بن گیا۔

ہوائیں یوں بند تھیں کہ درخت شیشوں کے شوکیس میں سجے پلاسٹک کے بنے ہوئے لگتے تھے۔ کوئی پتہ نہ ہلتا تھا۔ وہ حبس سے دم گھٹتا محسوس کرنے لگی اور چھت پر چلی گئی ہر شے تپ رہی تھی۔ آسمان پر بے شمار تارے چمک رہے تھے، اُس کے لمبے بال کھلے ہوئے تھے گریبان کھلا ہوا تھا۔ مگر چھت و منڈیر سب ہی تپ رہے تھے اور اُس کا دم چھت پر گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ موتیا اور رات کی رانی کی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی تھی پھر بھی اسے سکون نہ ملا۔ گرمیوں کی رات اُسے انتظار کے کرب میں مبتلا نہ دیکھ سکی اور اُلٹے پاؤں لوٹ گئی۔ وہ نہ آنے والا تھا نہ آیا۔

برکھا رُت آئی اور انگ انگ میں اُمنگ بھر گئی تو ڈھارس بندھی کہ وہ ضرور آئے گا۔ بادل سروں پر اِس طرح منڈلانے لگے کہ اُن کا بوجھ محسوس ہونے لگا گویا کاندھوں پر اُتر آئے ہیں۔ برسنے تو اس طرح جیسے شکنیں بتا رہے ہوں۔ نہ برستے تو ایسا لگتا جیسے نظریں چرا کر نکلے جا رہے ہیں اور روٹھ گئے ہیں۔ سب کچھ نمو کی جہد میں سرشار اور ہر شے میں زندگی کی خوشبو۔

راتوں کی طرح ایسی رات بھی بیت گئی۔

رُتوں کا ہیر پھیر۔ راتوں کا آواگون اور برہا۔

اُس نے سوچا۔

پیار پربت ہے۔

آکاش ہے۔

سمندر ہے اور وہ جنم جنم سے پیاسی ہے۔

وہ ٹھنڈے گہرے پانی کے کنویں کی اور چل نکلی۔

اُس کے ساتھ کوئی کھوجی نہ تھا جو قدموں کے نشان دکھاتا۔ وہ چلتی گئی۔

اُس کے پاؤں شل ہو گئے، لباس تار تار ہو گیا۔ بال رسی کی طرح بٹ گئے۔

جسم مٹی سے اٹ گیا اور اپنا نام تک نہ رہا تو وہ اچانک زیتون کے باغات میں نکل آئی جہاں بہت سی ننھی منی شمعیں روشن کئے وہ اپنی دھن میں کھویا ہوا تھا۔ اُس نے اسے اس حال میں دیکھا اور دوزانو اس کے سامنے چپ چاپ بیٹھ گئی۔

اُس نے آنکھیں کھولیں اُسے دیکھا اور اُس کے چہرے پر مسرت کی کرن چمکنے لگی۔

"یہ علم و دانش کی شمعیں اُٹھا لو۔ تم بہت دکھی ہو اور بہت دور سے چل کر آئی ہو۔ میرے پاس تمہیں دینے کو کچھ نہیں۔" اُس نے بڑی شفقت سے اُس سے بات کی۔ اُس کے لہجے کی سچائی اُس کے دل میں اتر گئی۔

"مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیئے۔ میں تمہارے لئے آئی ہوں۔" اُس نے کہا۔

اُس نے پھر آنکھیں موند لیں اور بولا۔

"تم کہیں اور چلی جاؤ۔ میں تمہارا کرب جانتا ہوں۔ جاؤ جہاں تمہارا جی چاہے۔ جہاں تمہیں سکھ اور شانتی ملے۔ یہ شمعیں بھی لے جاؤ۔ میں اور جلا لوں گا اور اپنا مشن جاری رکھوں گا۔ اب جاؤ۔"

تب اُسے علم ہوا کہ یہ وہ نہیں تھا۔ یا شاید ابھی وہ مکمل نہیں تھا اور وہ چل دی۔

وہ ایک ایسے شہر میں نکل آئی جہاں تیز روشنیاں رنگ برنگے لباس اور شور ہی شور تھا۔ پختہ سڑک کے موڑ پر ایک گلی تھی، اس گلی میں کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ فرش پر کتابیں، دیواروں پر کتابیں، طاقوں پر کتابیں اور چھت پر کتابیں وہ کتابوں

کی دیوار میں انارکلی کی طرح چنا ہوا اُسے مل گیا۔ اُس نے اُسے دیکھا اُس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ وہ کتابوں کی دیوار گرا کر آزاد ہو گیا۔

"آؤ میرے ساتھ بھاگ چلو۔" اُس نے سرگوشی کی۔

"میں تمہارے پاس ہی آئی ہوں۔" وہ بولی۔

"تو پھر آؤ اس دیوار کے پیچھے۔" اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ میں تمہیں بے شمار کتابیں دوں گا۔ تمہارے گرد کتابوں کا انبار لگا دوں گا۔

"میں اس دیوار میں مقید ہونا نہیں چاہتی۔" اس نے احتجاج کیا۔

"تم اب کہیں نہیں جا سکتیں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ تب اُسے وہسکی اور تازہ چھپے ہوئے نوٹوں کا بھبکا آیا۔

وہ رونے لگی۔

"اب یہ نہیں ہو سکتا۔"

اُس نے اُس کی منتیں کیں اپنی چوڑیاں اور انگوٹھیاں اُس کے قدموں میں ڈال دیں مگر وہ اس کا ہاتھ پکڑے اُسے کھینچتا ہی رہا اور وہ روتی رہی۔

اُسے معلوم ہوا کہ یہ وہ نہیں تھا۔

اس نے خدا سے دعا مانگی۔

پیار شکتی ہے۔

پیار پرماتما سمان ہے۔

عین اُسی وقت پولیس آگئی اور وہ کتابوں کی دیوار میں دفن ہو گیا۔

اُس کے گرد کتابیں ہی کتابیں تھیں، لیکن اُس کے وجود میں حرف کی خوشبو نہ تھی صرف وہسکی اور تازہ چھپے ہوئے نوٹوں کی بو تھی۔

وہ اور آگے بڑھ گئی۔

وہ اپنی دُھن میں چلتی ہی چلی گئی۔ چشمے آئے اور گذر گئے۔ چٹیل میدان پیچھے رہ گئے۔ وہ پہاڑی راستوں پر جا نکلی۔

سرحدی چوکی کے قریب پہاڑیوں کے درمیان وہ اُسے نظر آیا۔ اُس کے قدم تیز ہو گئے۔ وہ اس کے قریب پہنچی دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

وہ بڑا اسمارٹ تھا۔ اُس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی۔ اُس میں خود اعتمادی تھی اور خلوص تھا۔ پہلی نظر میں وہ اُسے ایک مضبوط چٹان کی طرح نظر آیا اور وہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرنے لگی۔

اُس نے اُس کو خیمے میں بٹھایا گرم کافی سے اُس کی تواضع کی اور دُنیا جہان کے قصّے سنائے۔

اچانک اُسے محسوس ہوا کہ وہاں خون کی بُو ہے۔ اُسے اُس کے لباس اور ہاتھوں پر انسانی خون کے دھبے نظر آنے لگے۔ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ خیمے سے نکل کر بھاگی۔ یہ وہ نہیں تھا۔ وہ پہاڑی ناہموار راستوں پہ گرتی پڑتی بھاگتی ہی چلی گئی۔

میلوں فاصلے سے اُس نے مڑ کر دیکھا وہ خیمے کے دروازے پر کھڑا چپ چاپ اُسے دیکھ رہا تھا۔

پہاڑیوں کے ڈھلوان سے اُتر کر وہ سرسبز شاداب میدانوں میں آگئی جہاں پیلو کے درخت تھے، سبزہ زار تھے۔ جہاں چرواہے بنسیاں بجا رہے تھے۔ دریاؤں کے دیس سے آگے جہاں سرسوں کے کھیت تھے۔ وہ چلتی ہی گئی۔ پھر وہ ایک ویران مندر کی شکستہ دیوار کے قریب کھڑا ہوا اُسے مل گیا۔ اُس کے سر پہ پیپل کے درخت کا سایہ تھا اور پیروں میں خشک پتے تھے اوپر سب سے موٹی شاخ پہ نیلکنٹھ اپنے پر پھیلائے سوچ رہا تھا۔

اُس کی قمیض کاندھوں پہ پھٹی ہوئی تھی اور جوتوں کے تلے گھسے ہوئے تھے اُس کے ہونٹ خشک اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔

وہ بولا۔

"میرے قریب آؤ۔ میں کب سے تمہارا منتظر ہوں۔ اب تھک کر نڈھال ہو چکا ہوں۔ تم نے بہت دیر کر دی میں اپنا گاؤں، آموں کی پال، ٹھنڈے اور میٹھے

پانی کے کنوئیں، پگڈنڈیاں، جامن کے سایہ دار درخت برگد کی زمین تک جھولتی ہوئی جٹائیں اور ارہر اور جوار کے کھیتوں کی مہک چھوڑ کر تمہاری تلاش میں ادھر آنکلا۔ میں نے تمہیں اُس خوشبو سے پہچان لیا جو میرے ذہن میں ہمیشہ سے محفوظ ہے۔ تم اپنے ساتھ وہی خوشبو لائی ہو۔ تم نے بھی پیلو کی خوشبو، کینو کے رنگ اور شہد کی مٹھاس سے منہ موڑا ہے۔ تم نے ہیر سیال کی لے سے جدائی کا گھاؤ سہا ہے۔ تمہارے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں اور ہونٹ خشک ہو گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں تم نے مجھ سے اِدھک دُکھ جھیلے ہیں۔

وہ بے جھجک اُس کے قریب چلی گئی اور دونوں خوشبوئیں مل کر سارے میں پھیل گئیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اُس کے کاندھے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رو لے۔ لیکن اُس نے اُسے روک دیا۔

اب دیر ہو چکی ہے۔

اُدھر دیکھو۔ میرا خاندان۔

اُس نے دیکھا۔

ایک عورت مکان کی کچّی دیوار سے اُپلے اُتار رہی تھی۔ اُس کے جسم پر بوسیدہ کپڑے تھے۔ پاس ہی کئی بچّے زمین پر بیٹھے ننھی منی کتابیں لئے اپنے سبق یاد کر رہے تھے جیسے شمعیں جل رہی ہوں۔

تم نے سچ مچ بہت دیر کر دی۔

اب لوٹ جاؤ۔ ہم نے ایک دوسرے کو پالیا ہے۔ مگر اب اس سے قبل کہ سورج ڈوب جائے تم لوٹ جاؤ۔

اگر تم اور آگے بڑھیں اور سورج غروب ہو گیا تو تمہاری ماں کا سینہ تیروں سے چھلنی ہو جائے گا اور تمہارا باپ اپنے کاندھوں پر اپنی صلیب لئے شہر کے چوراہے پر جا کھڑا ہو گا۔ اُس کی گردن جھکی ہو گی اور چاروں طرف چہرے ہی چہرے ہوں گے۔

بس اب تم چلی جاؤ۔

اُس نے دوبارہ کچی دیوار سے اُپلے اُتارنے والی عورت کو دیکھا اُس کے ہاتھ مٹی میں سنے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے، قمیض کا گریبان کھلا ہوا تھا۔ ماتھے سے پسینہ بہہ کر گلے سے اُترتا ہوا سینے تک آ گیا تھا۔ مگر وہ اپنے کام میں منہمک تھی اُس کے چہرے پر سکون اور خود اعتمادی تھی۔

بچّے زمین پر بیٹھے ہوئے اپنی اپنی کتابیں کھولے اپنے سبق یاد کر رہے تھے اُن کے لباس ناموزوں اور بوسیدہ تھے۔ اُن کے چہروں پر معصومیت اور لگن تھی۔

اُس کے بوٹ کے تلے گھِسے ہوئے تھے قمیض پھٹی ہوئی تھی لیکن اس کے لہجے میں سچائی، آہنگ میں پیار اور آنکھوں میں انتظار تھا۔

وہ بولی۔

تم ملے بھی تو کس طرح۔ واماندہ، زندگی کے بوجھ سے کچلے ہوئے، آزردہ۔

مَیں نے ہی دیر کر دی مگر تم مل تو گئے مَیں نے تمہیں پا لیا۔ میری تلاش ختم ہوئی۔

وہ مسکرائی۔ اُسے اس پر پیار آ گیا۔ اُس نے اس کا چہرہ جی بھر کے دیکھا اور لوٹ گئی۔ جب وہ گھر آئی تو گھر کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ اس کی ماں دروازے پر کھڑی خالی خالی نظروں سے گھر کی طرف آنے والی ویران سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کا باپ صحن میں صلیب لئے جانے کو تیار کھڑا تھا۔

"متیار اب تو سورج ڈوب گیا۔ اب آئی تو کیا۔ کسی کا مقدر چھلنی ہونا ہے اور کسی کا مصلوب ہونا ہم تیار ہیں"۔

وہ بھاگ کر چھت پر پہنچی۔ طویل مسافت نے اُس کے پاؤں زخمی کر دئے تھے۔ جسم شل کر دیا تھا۔ دماغ سُن کر دیا تھا اور زبان گنگ کر دی تھی۔ چھت پر جہاں کبھی موتیے اور رات کی رانی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی خون اور لوہے کی بو تھی۔ اُس نے پچھم کی طرف دیکھا مسجد کا سنہرا کلس ابھی تک چمک رہا تھا اور سورج کا سرخ گولا مینار کے ساتھ لٹک رہا تھا۔

سورج مصلوب تھا

○

علی الصبح لڑکیوں کو اڈے پر واپس پہنچاتا۔ اس وقت معدہ شراب سے آنکھیں نیند سے اور جیبیں نوٹوں سے لبالب بھری ہوتیں۔ گر کر سوتا تو گیارہ بجے سے پہلے آنکھ نہ کھلتی اور آنکھ کھلتے ہی پھر رمی اور شراب کا دور شروع ہو جاتا۔ ایسے میں کیا اچھا ہے کیا برا ہے سوچنا مجیدے کے بس میں کب تھا۔

———— لڑکی میرے گاؤں کی

لڑکی میرے گاؤں کی

مجیدا شام سے بیٹھا سونے ویران بازار کی بند دوکانوں کے سامنے پھیلی ہوئی غلاظت میں لوٹتے ہوئے کتوں کو دیکھ رہا تھا۔ دوکانوں کے سامنے تیز روشنی والے بلب بجھے ہوئے تھے اور قطار اندر قطار بند دوکانوں کے سامنے خالی تھڑے بڑے منحوس اور بھیانک لگ رہے تھے۔ انہیں خالی تھڑوں میں سے ایک پر ایک بھوری سی موٹی بلی اپنے آدھے درجن بچوّں کو بے نیازی سے لیٹی دودھ پلا رہی تھی، دوسرے پر ایک فقیر بوری اوڑھے بے خبر سو رہا تھا اور تیسرے پر ایک خارش زدہ کتیا اپنے پیر کے پرانے زخم کو چاٹتی ہوئی کوں کوں کئے جا رہی تھی۔ سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور خالی تھی۔ کوئی راہ گیر نظر نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی رکشہ گڑھوں پر اُچھلتی شور مچاتی گذر جاتی تو سڑک اور زیادہ خالی، ویران اور ٹوٹی ہوئی محسوس ہوتی۔

رات کے دس بجے تھے اور نئے قانون کا نفاذ ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ اس وقت مجیدا اُداس ہی نہیں تھا بھوکا بھی تھا اور اُسے شراب بھی نہ ملی تھی۔ دھندا

بند تھا۔ جس دن بدکاری کے خلاف نئے قانون کا اعلان ہوا ساری لڑکیاں کوٹھے چھوڑ کر بغیر بتائے، بغیر مشورے کئے اور دودھ فروشوں، حلوہ پوڑی والوں، مٹھائی فروشوں اور میک اپ کا سامان فروخت کرنے والے دوکان داروں کا اُدھار چکائے بھاگ گئیں جیسے اس محلے میں طاعون پھیل گیا ہو۔ فلیٹوں کی بالکونیاں سنسان ہو گئیں پہلی شام تو گئی رات تک گجرے والے ہاتھوں میں گجرے ٹانگے اور منہ لٹکائے پھرتے رہے لیکن جب ایک بھی گجرا نہ بکا تو تھک کر بیٹھ گئے اور ایک ایک پھول توڑ کر گٹر میں ڈال دیئے، چاندی کے ورق لگے ہوئے پان سرخ کپڑوں پہ پڑے پڑے زرد ہو گئے گرم دودھ کا کڑھاؤ اسی طرح بھرا رہا اور چولہوں میں جلنے والی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ آس پاس کے ہوٹلوں میں پوری زور شور سے ریکارڈنگ ہوتی رہی مگر اس محلے کی رونق نہ لوٹی اور بالکونی کے بند دروازے نہ کھل سکے۔ مجیدے کا جی چاہا کہ اُٹھ کر ان بند دروازوں پر اتنے پتھر برسائے کہ بالکونیوں کے بند دروازے سنگسار ہو جائیں مگر اس کا مسئلہ بند دروازے ہی نہیں تھے۔ بند دروازوں کے پیچھے سے ایکا ایکی چلی جانے والی بکاؤ جنس تھی جو اب ان بند دروازوں کے پیچھے موجود نہ تھی

مجیدا بے دلی سے اُٹھا اور بے مقصد چلتا ہوا ٹُنڈے کے تنور پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں بھی ویرانی تھی۔

"سنا مجیدے امین کا کوئی خط آیا"۔ ٹُنڈے نے پوچھا

"ہاں آیا ہے۔ لکھا ہے میرے لئے سارا انتظام ہو گیا ہے"۔ مجیدا بے دلی سے بولا جیسے ویزا ملنے کی اسے کوئی خوشی نہ ہو۔

"پھر تو بھی امریکہ چلا جائے گا"۔ ٹُنڈا اُداسی سے بولا۔

"سوچتا ہوں چلا جاؤں۔ اب یہاں رہ کر کروں گا بھی کیا"۔

مجیدے نے بڑی حقارت سے بالکونیوں کے بند دروازوں کی طرف دیکھا۔

"سالا بازار تو قبرستان دکھائی دیتا ہے۔ یہاں اب کیا رکھا ہے"۔

"مجیدے تو دیکھ تو سہی۔ یہاں پھر رونق لوٹ آئے گی"۔ ٹُنڈا بڑے اعتماد سے

بولا۔ حالانکہ اسے خود اپنی بات پر پورا یقین نہ تھا۔

" دیکھ ٹنڈے مینا ٹھیک ہی کہتا تھا کہ اب حالات بدلنے والے ہیں۔ یہاں دھندا بند ہو جائے گا۔ اور اُس نے پہلے سے بندوبست کر لیا اور گلّو اور سانولی کو لے کر نکل گیا۔ اور تو جو رونق لوٹنے کی بات کرتا ہے تو سُن لے کہ میرا دل بھی اس دھندے سے بھر گیا ہے۔ دھندا بند ہوا تو ٹھیک ہی ہوا۔ مگر پیارے اَپن کو تو اور کوئی کام آتا بھی نہیں۔"

"تو فکر کیوں کرتا ہے۔ تو تو امین کے پاس چلا جا۔ جو جی میں آئے کام کرنا۔ وہاں کاروبار کی کیا کمی ہے۔" ٹُنڈے نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

"سالا مینا تو اُدھر بھی یہ ہی کام کرتا ہے۔ لکھا ہے ایک دو چھوکریاں اگر لا سکوں تو وہ ویزا بھجوائے گا۔ کہتا ہے ایک دو لڑکیوں سے فٹا فٹ شادی کر لے۔ باری باری بلالے گا۔"

گلیوں میں گشت کرنے والی پولیس کی سیٹیاں بجنے لگیں۔

" چلوں یار ٹُنڈے نہیں تو دیکھتے ہی ایک سو تو میں بند کر دیں گے۔ جیبیں بھی خالی ہیں۔ لا سگریٹ دے۔"

دونوں نے سگریٹ جلائی اور مجیدا دوکانوں کے سامنے خالی ویران تھڑوں کو دیکھتا ہوا چل دیا۔

گلیوں میں سیٹیوں اور بھونکتے ہوئے کتوں کی آوازکے علاوہ خاموشی تھی۔

مجیدا اپنے دو کمروں کے خوبصورت فلیٹ میں داخل ہوا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ فلیٹ شہر کے خوبصورت صاف ستھرے علاقے میں تھا اور گو کہ کرایہ زیادہ تھا لیکن یہاں کے لوگ ایک دوسرے سے بے نیاز تھے۔ کوئی کسی کے معاملات میں دخل نہ دیتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں مجیدے نے برہنہ اور نیم برہنہ غیر ملکی اور پاکستانی فلم ایکٹریسوں کی بے شمار تصویریں دیوار پہ لگا رکھی تھیں۔ ایک طرف شوکیس پر ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹ رکھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں رنگین ٹیلی وژن رکھا ہوا تھا۔

مجید اب اس فلیٹ میں نہ رہ سکے گا۔ سات سو پچاس روپے ماہانہ کرایہ ادا کرنا اُس کے بس سے باہر تھا۔ ذریعہ آمدنی یک لخت بند ہو جانے سے وہ جیسے بے دست و پا ہو گیا تھا۔ اُس کے سینے پر اپنے خوبصورت سجے سجائے فلیٹ اور اُس میں رکھے ہوئے سامان کو دیکھ کر گھونسہ سا لگا۔ اُس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے ان تمام چیزوں کو دیکھا اور دروازہ کھول کر بالکونی میں کھڑا ہو گیا۔ باہر خوشگوار ہوا چل رہی تھی اور واٹر پمپ کی عمارت کے اوپر پورا چاند چمک رہا تھا۔ واٹر پمپ کی عمارت کے پیچھے ناریل اور املی کے درخت ہوا سے ہولے ہولے جھوم رہے تھے۔

واٹر پمپ کی عمارت، ناریل اور املی کے درخت پر چمکتے ہوئے پورے چاند کو دیکھ کر اچانک اُسے بالی یاد آگئی۔ بالی کو اُس نے بچپن سے ہی پیار کیا تھا۔ گاؤں کے مکتب میں دونوں مولوی صاحب سے اُردو قاعدہ پڑھا کرتے تھے۔ لیکن مجید اُردو کا قاعدہ نہ ختم کر سکا اور مولوی صاحب کی قمچیوں سے بالی کے سامنے ایک دو بار پٹا تو اُس کا جی پڑھائی سے ایسا اُچاٹ ہوا کہ اُس نے پھر کبھی کتاب کو ہاتھ نہ لگایا۔ لیکن بالی سے اُس کی ملاقات ہوتی رہی۔ بالی مکتب سے چھٹی کے بعد اُس کے گھر آجاتی اور دونوں باغوں اور کھیتوں کی طرف نکل جاتے اور بڑی دیانتداری اور خلوص سے ایک دوسرے کے لئے دعائیں کرتے۔ لیکن بالی جب سیانی ہو گئی تو اُن کا ملنا جلنا بند ہو گیا۔ کبھی کبھی راتوں میں جب چاند گاؤں کے سب سے اُونچے املی کے درخت پر طلوع ہوتا تو وہ بالی کے گھر سے ملحق کنوئیں پر چلا جاتا اور ایک لمحے کے لئے بالی سے مل لیتا۔ اور یہ لمحہ دونوں آنسو بہانے اور ایک دوسرے کو نہ بھولنے کے وعدوں میں گذار دیتے۔

مجید اجب نوکری کی تلاش میں شہر آیا تو اُسے صرف ایک خیال تھا کہ نوکری ملتے ہی وہ گاؤں جا کر بالی سے شادی کرلے گا لیکن شہر میں اُس کی ملاقات مینے سے ہو گئی۔ اور وہ مینے کے ساتھ عورتوں کی دلالی کرنے لگا۔ اس کاروبار میں آسانی سے حاصل کی ہوئی دولت کی اتنی ریل پیل ہوئی کہ مجید اس بات سے بالکل بے نیاز

ہو گیا کہ یہ کاروبار بُرا ہے۔ اُسے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ روزمرہ گیارہ بجے دن میں سو کر اٹھتا بار والے چھوکرے سے سب کے لئے چائے آجاتی۔ ناشتہ کر کے مینا اور دوسرے ساتھی مرد یا عورتوں کے ساتھ رمی کی محفل جم جاتی پھر ہوٹل سے کھانا آجاتا اور رمی کھیلتے کھیلتے کھانا کھالیا جاتا۔ پھر رمی ہی کے کھیل میں شراب کا دور چلتا۔ شام پانچ بجے دوسروں کی طرح مجیدا حمام سے غسل کرتا لانڈری سے دھلا ہوا بوسکی کا کُرتا شلوار آجاتا۔ لباس بدل کر جسم پر خوشبو چھڑکتا اور گاہکوں کی تلاش میں خوبصورت گھسّہ پہنے ہاتھ میں فارن سگریٹ کا پیکٹ اور منہ میں خوشبودار پان دبائے ہوٹلوں کی طرف چل دیتا۔ گاہکوں سے سودا کرتا اور لڑکیوں کو اُن کے پاس چھوڑ کر خود دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شراب اور سگریٹ پیتا رہتا۔ علی الصبح لڑکیوں کو اڈے پر واپس پہنچاتا۔ اُس وقت معدہ شراب سے آنکھیں نیند سے اور جیبیں نوٹوں سے لبالب بھری ہوتیں۔ گر کر سوتا تو گیارہ بجے سے پہلے آنکھ نہ کھلتی اور آنکھ کھلتے ہی پھر رمی اور شراب کا دور شروع ہو جاتا۔ ایسے میں کیا اچھا ہے کیا بُرا ہے سوچنا مجیدے کے بس میں کب تھا۔

شہر کے خوبصورت علاقے میں فلیٹ لے کر اور اُسے حتیّٰ المقدور سجا کر جب وہ بالی سے شادی کی غرض سے گاؤں پہنچا تو اس کی شہرت اس سے پہلے گاؤں پہنچ چکی تھی۔ بالی سے شادی تو خیر کیا ہوتی گاؤں والوں نے مجیدے کے گاؤں پہنچتے ہی مجیدے اور اُس کی ماں دونوں کا حقہ پانی بھی بند کر دیا۔ گاؤں کے کسی فرد نے مجیدے کے سلام کے جواب میں وعلیکم السلام تک نہ کہا۔ اور جب ماں نے رو کر اُسے بتایا کہ بالی عورتوں کے دلال سے شادی کرنے سے بہتر مر جانا سمجھتی ہے تو مجیدے ماں کے زانو پر سر رکھ کر رونے لگا۔ ماں نے اسے بتایا کہ جب یہ خبر گاؤں پہنچی تو پہلے تو بالی نے پنجگانہ نمازیں پڑھ کر تیرے راہ راست پر آنے کی دعائیں مانگیں پھر اُس نے یہ دعا کی کہ اُس کے دل سے تیری محبت نکل جائے۔ بالی کہتی تھی کہ اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہو گی کہ اس کی پہلی دعا تو قبول نہ ہوئی مگر دوسری دعا قبول ہو گئی۔ اور اب وہ بڑی

حقارت سے کہتی ہے کہ دلّوں کا کیا۔ پیسے ملیں تو وہ ماں، بیوی اور بیٹی کو بھی دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اُن کے لئے تو ماں، بہن، بیوی اور بیٹی سب بازار میں بیچ دینے کے لئے ہوتی ہیں۔

بالکونی میں کھڑے کھڑے واٹر پمپ کے ساتھ ناریل اور املی کے درخت کے اوپر روشن چاند کو دیکھتے ہوئے اس نے دیانتداری سے سوچا۔

"بالی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ جب کبھی مال کی کمی سے تنگی آتی تو وہ اب تک کتنی دفعہ بالی کا سودا کر چکا ہوتا۔ اب عورت اُس کے نزدیک صرف ایک سودا ہے۔ جو خریدا اور بیچا جا سکتا ہے"۔ وہ بالکونی سے کمرے میں آ گیا۔

جب جہاز کافی بلندی پر پہنچ گیا تو وطن چھوٹنے کا غم شدید ہو گیا۔ اُس کے وطن میں اُس کے لئے اب کوئی جگہ نہیں تھی۔ شراب وہ چھوڑ نہ سکتا تھا اور ملک چھوڑنا اُس کے لئے آسان تھا۔ وہ تو مسلمان اس لئے ہی تھا کہ اس کا باپ مسلمان تھا اور اُس کا نام عبد المجید تھا۔ ورنہ وہ تو مولوی صاحب کی قمچیوں کے خوف سے پہلا قاعدہ پڑھے بغیر بھاگ آیا تھا پھر نہ اس نے کبھی کوئی کتاب ہاتھ میں لی اور نہ کسی نے اُسے کبھی کچھ بتایا۔ عید کے دن وہ بھی محلے والوں کے ساتھ عید گاہ نماز کے لئے چلا جاتا اور جیسے سب کرتے وہ بھی نماز ادا کرتا اور خدا کی اور قرآن کی قسمیں اپنے جھوٹ کو چھپانے یا سچ کرنے کے لئے کھا لیتا۔ لیکن اب اُس کے لئے شراب کا حصول مشکل تھا۔ اور دھندہ تو چوپٹ ہو ہی گیا تھا پھر اُسے وطن سے کیا دلچسپی تھی۔ اس نے جہاز میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا جائزہ لیا۔ پورے جہاز میں تھوڑے سے مسافر تھے اور بیشتر سیٹیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ مسافروں میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی۔ سامنے کی سیٹ پر ایک غیر ملکی جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکی مرد سے بیزار سی بیٹھی میگزین کے ورق اُلٹ رہی تھی اور اُس کے ساتھ بیٹھا ہوا مرد بڑی دلچسپی سے کالے برقعہ میں بیٹھی ہوئی تنہا عورت کو دیکھ رہا تھا۔ یہ عورت مجید کی سیٹ کے عین سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے اُسے اُس وقت بھی دیکھا تھا۔ جب

وہ جہاز میں داخل ہوا تھا۔ کالے برقعے میں لپٹی ہوئی عورت جس نے نقاب سے چہرہ چھپا رکھا تھا اسے جہاز کے اندر بڑی اجنبی سی لگی تھی اور اسی لئے شاید غیر ملکی بھی اسے بڑی حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

مجیدے کا دل سیاہ برقعے میں لپٹی ہوئی عورت کو دیکھ کر آپ ہی آپ زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُسے اُس عورت میں نہ جانے کیوں غیر معمولی کشش محسوس ہوئی۔ اُس نے سوچا شاید ملک چھوڑنے کے بعد اپنے ملک کے ماحول کا برقعہ میں لپٹی ہوئی عورت کی صورت میں ایک ٹکڑا اُسے پرکشش لگ رہا ہوگا۔ وہ برقعوں میں لپٹی ہوئی بے شمار عورتیں شب و روز ہی دیکھتا رہا تھا مگر اس جہاز میں ایک تنہا عورت کا سیاہ برقعہ میں ہونا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ مجیدے نے سیٹ سے گردن ٹکالی اور سوچتے سوچتے سو گیا۔

مجیدا جب بیدار ہوا تو بیشتر مسافر سو رہے تھے۔ غیر ملکی جوڑا مسافروں کی غفلت سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ برقعہ پوش عورت کا برقعہ سر سے ڈھلک کر گلے میں جھول رہا تھا۔ اس عورت کو دیکھتے ہی مجیدے کو گمان ہوا کہ شاید بالی ہے۔ اُس کا دل اس زور سے دھڑکا کہ اُس کی آواز سارے جہاز میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُس نے بالی کو بچپن سے جوانی تک دیکھا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ کھیل کر جوان ہوئے تھے۔ اگر گذشتہ دو سالوں میں جب سے وہ گاؤں والوں کی بے رخی سے دل برداشتہ ہو کر نکلا تھا اُس نے بالی کو نہ دیکھا تھا تو کیا ہوا۔ برقعہ والی عورت نے مڑ کر مجیدے کی طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔ لیکن فوراً ہی اُس نے دوبارہ اُس کی طرف دیکھا اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی رہ گئے۔ وہ بالی تھی۔

جب جہاز کے لینڈ کرنے کا اعلان ہوا تو بالی نے مجیدے سے کہا کہ اب وہ اُس کے پاس سے چلا جائے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کا شوہر مجیدے کو اس کے ساتھ دیکھے اور مبادا وہ مجیدے کو پہچانتا ہو کر اُس کی ازدواجی زندگی میں رخنہ پڑ جائے بالی نے اسے بتایا کہ چھ ماہ قبل ایک پاکستانی تاجر سے جو امریکہ میں تجارت کرتا

ہے اس کی شادی ہوگئی ہے۔ اس کا شوہر بہت شریف اور مالدار انسان ہے۔ اُس نے بالی کی ماں سے وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ امریکہ میں بھی بالی کو بغیر برقعہ باہر نہ نکالے گا۔ بالی نے مجیدے کو بتایا کہ اب اُس کے دل میں مجیدے کے لئے نہ محبت ہے، نہ نفرت۔ اُسے وہ ایک عام اجنبی آدمی سمجھتی ہے۔ حالانکہ اُسے ایسے انسان سے جو عورتوں کی دلالی کرتا ہو کراہیت ہوتی ہے۔ مگر اب اُس کا مجیدے سے چونکہ کوئی واسطہ ہی نہیں اِس لئے وہ بس اسے ایک عام اجنبی آدمی سمجھتی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بالی نے اُسے یہ بھی بتایا کہ اب وہ اپنے شوہر کے پاس جارہی ہے جہاں وہ مستقل رہائش اختیار کرلیں گے۔

ایرپورٹ سے باہر مینا اُس کا منتظر تھا۔ مینے کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ مینے نے مجیدے سے اُس کا تعارف کرایا۔

"یہ فضل الرحمان ہے ہمارا پارٹنر" مینے نے کہا۔

"اور یہ عبدالمجید ہمارا نیا شریک" دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔

فضل الرحمان نے ایرپورٹ سے باہر آتی ہوئی بالی کو دیکھا اور اُس کی طرف ہاتھ ہلاتا ہوا بھاگا۔ مجید افضل الرحمٰن اور بالی کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

"وہ بالی ہے۔ فضلے کی تیسری بیوی۔ دو بیویاں یہاں پہنچ چکی ہیں۔ یہ نیا مال ہے۔ فضلا چھ ماہ پہلے شادی کر آیا تھا۔ یہاں عجیب حال ہے۔ کالے گورا مال پسند کرتے ہیں۔ گورے کالا۔ اور یہ مال دونوں طرف چل جاتا ہے۔ لوگ نئے تجربوں کے عادی ہیں۔ مجیدے یہاں پیسہ بھی ہے۔ شراب بھی اور عورت بھی۔ سب کھلا ہے۔" مینے نے کہا۔

"مینے ——" مجیدے نے کہنا چاہا مگر مینا بیچ میں پھر بول پڑا۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔ دیکھنا یہ مال ایک سال کس طرح ہاتھوں ہاتھ چلے گا۔ تازہ ہے نا۔"

فضلا اور بالی اُن کے قریب آگئے کسی نے کسی کا تعارف نہیں کرایا۔ بالی مجیدے

کو فضل الرحمان تاجر کے ساتھ دیکھ کر بھی کچھ نہ بولی۔ مجیدے کو ایسا لگا جیسے بالی کی زبان گنگ ہو گئی ہے۔ وہ آخر کیوں فضلے سے نہیں پوچھتی کہ وہ مجیدے کو کس طرح جانتا ہے۔

مینے نے ٹیکسی روکی۔

مینا، فضلا اور بالی پچھلی سیٹ پر اور مجیدا اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"فارٹی سکنڈ اسٹریٹ" فضلے نے ڈرائیور سے کہا اور ٹیکسی چل دی۔

مجیدے نے سوچا کہ اس ٹیکسی میں مجیدا، مینا اور فضلا عورتوں کے دلال بیٹھے ہوئے ہیں اور اسی ٹیکسی میں بالی ہے جو عورتوں کے دلالوں سے نفرت کرتی ہے مگر اسے علم نہیں کہ وہ اُن کے ہاتھوں اس وقت بازار میں آگئی ہے اور بکاؤ مال ہے۔

مجیدے نے کہا۔

"کاش گاؤں والے حقہ پانی بند کرنے کے بجائے اُسے کمر تک زمین میں دفن کر کے اُس پر پتھروں کی بارش کر دیتے اور اُس کی طرف آنے والا پہلا پتھر اُس کی ماں کا ہوتا۔"

مجیدے کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ ٹیکسی تیزی سے فارٹی سکنڈ اسٹریٹ کی طرف بھاگی جارہی تھی۔

○

بیری کا تنا اپنی خمیدہ کمر پہ ہونی انہونی کا بوجھ
اٹھائے کفر بک رہا تھا وہ سانس لینے کو رکا تو لانبی جڑ کے
رونے کی آواز آئی جو انتھک محنت سے خوراک مہیا کرتی ہوئی
رب کے حضور امر بیل کے ٹھکانے لگنے کی دعائیں مانگتی ہوئی
اپنی کوکھ پہ شرمساری کے دو ہتھڑ مار رہی تھی جس نے امر بیل
کو جنم دیا تھا۔"

—— بیری کا درخت

بیری کا درخت

اپارٹمنٹس کی خوبصورت عمارت کے سامنے سڑک کے اُس پار ٹوٹی پھوٹی قدِ آدم چہار دیواری کے اندر چھوٹے سے مکان کے صحن میں اُگے ہوئے نیم اور بیری کے دو درختوں میں تھوڑے سے فاصلے کے باوجود صرف بیری کے درخت کو امر بیل نے قریب قریب ڈھانپ لیا تھا اور بیری کی بیشتر پتیاں زرد رو ہو گئی تھیں اور شاخیں کمزور ہو کر جھول سی گئی تھیں لیکن نیم کا پیڑ سرسبز و شاداب تھا اور مارننگ واک پر نکلنے والوں میں سے اکثر کو اپنی سڑک کی طرف خمیدہ شاخوں سے دتون مہیا کرتا رہتا تھا۔ ہوا کے تیز جھونکے سے نیم کا درخت بیری کے درخت پر جھک گیا اور بیری کے درخت کی سسکتی ہوئی شاخوں کی سائیں سائیں کے باوجود امر بیل کے خیالات کی گونج سن لی۔

"میں امر بیل اسی درخت کا حصہ ہوں مجھے بھی جینے کا حق ہے۔ میں اسی درخت میں پیدا ہوئی ہوں اسی میں جوان ہوئی ہوں۔ اگر میری جوانی یوں ہی رائیگاں ہے تو

اس میں میرا کیا قصور ہے۔ بیری کے درخت پر آخر کوئی پتھر کیوں نہیں آتا میں اگر بیری پر بوجھ ہوں تو میرا کرب کب کسی نے سمجھا ہے۔"

امر بیل خاموش ہوئی تو ہری بھری نیم کو بیری کے درخت سے دوسری کرخت آواز سنائی دی۔ بیری کا تنا اپنی خمیدہ کمر پر ہونی انہونی کا بوجھ اٹھائے کفر بک رہا تھا۔ وہ سانس لینے کو رکا تو لمبی جڑ کے رونے کی آواز آئی جو انتھک محنت سے خوراک مہیا کرتی ہوئی رب کے حضور امر بیل کے ٹھکانے لگنے کی دعائیں مانگتی ہوئی اپنی کوکھ پر شرمساری کے دو ہتھڑ مار رہی تھی جس نے امر بیل کو جنم دیا تھا۔

مخالف سمت سے ہوا کا دوسرا جھونکا آیا تو نیم اپنی سرسراتی ہوئی پتیوں سمیت اس سڑک کی طرف جھک گئی جس پر مارننگ واک کرنے والے گذرتے تھے اور داتون توڑا کرتے تھے۔ نیم کو کسی سے کوئی شکوہ نہ تھا۔

اپارٹمنٹس کی تیسری منزل کی خوبصورت بالکونی سے سامنے سڑک کے اس پار مکان کے صحن میں اُگے ہوئے بیری کے درخت کو دیکھتے ہوئے اس نے بڑے کرب سے سوچا۔

"تنہائی اور ناقدری کا زہر سارے میں پھیل چکا ہے۔"

اپارٹمنٹس کی لفٹ گھوں گھوں کرتی ہوئی اوپر نیچے آجا رہی تھی۔ لوگ گھروں کو لوٹ رہے تھے اور گھروں سے جا رہے تھے۔ سورج ابھی غروب نہ ہوا تھا۔ صحن میں بیری اور نیم کے درختوں کے سائے مٹ چکے تھے۔ بیری کے درخت پر پھیلی ہوئی امر بیل کی زردی شام کے سایوں میں نمایاں ہو گئی تھی۔

لاؤنج میں ابھی ٹی وی نہیں کھلا تھا۔ ممی اور ڈیڈی کافی کی پیالیاں سامنے رکھے اونگھ سے رہے تھے۔ آس پاس ڈیڈی کے سگار کی راکھ بکھری ہوئی تھی اور دھواں چھت میں منڈلا رہا تھا۔

"وہ گھر سے باہر بھی تو نہیں نکلتی۔" ممی نے اپنی بار بار کی دہرائی ہوئی شکایت دہرائی۔

"ہوں اوں" ، ڈیڈی نے ہمیشہ کی طرح منہ میں سگار دبائے دبائے لمبی سی ہوں کردی۔

"رضیہ، ذکیہ بھی تو اُسی کی بہنیں ہیں۔ رضیہ نے شادی بھی کرلی اور میری ذکیہ بھی کرہی لے گی۔ اُس کا دوست کتنا اچھا لڑکا ہے۔"

"ہوں اوں۔"

"اب بیری کے درخت پر پتھر نہیں آتے۔ بیریاں خود تلاش میں نکلتی ہیں۔ زمانہ بدل گیا۔ دیکھ لینا بس یونہی بالکونی میں کھڑے کھڑے بال پکالے گی۔"

"ہوں اوں۔"

"ہماری زندگی اب کتنی ہے۔ پھر کون یہ پہاڑ کا بوجھ اٹھائے گا۔"

"ہوں اوں"

لفٹ گھوں گھوں کرتی اوپر نیچے کے چکر لگائے جارہی تھی۔ اس نے بالکونی میں کھڑے کھڑے سورج غروب ہوتے دیکھا، پھر روشنیاں دیکھیں اور اسے ڈپریشن ہونے لگی۔ اُسے نہ جانے کیسے ڈپریشن میں گنگنانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ڈپریشن اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا ذریعہ تھی اس نے گنگنانا شروع کردیا۔

میرا دل۔

اور سوچ مری۔

رشتے کی دیوار بنی۔

وہ ان ٹکڑوں کو کاغذ پر لکھ لینا چاہتی تھی۔ وہ ممی اور ڈیڈی کو ڈسٹرب کئے بغیر دبے پاؤں لاؤنج سے ہوتی ہوئی سائڈ روم اور پھر ذکیہ کے بیڈ روم میں رکھے ہوئے رائٹنگ ٹیبل پر سے بال پن اور کاغذ لینے کے لئے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے ذہن میں اشعار گونج رہے تھے میز پہ بال پن اور کاغذ اور بیڈ پر بدن پڑے ہوئے تھے تخلیق کا عمل جاری تھا۔ کسی نے کوئی پروا نہیں کی۔ اُس نے خود بھی واپس لوٹنے کی کوشش نہیں کی۔ اُس نے نہ کاغذ اٹھایا نہ بال پن وہ

اشعار سے بے نیاز اس کیفیت سے نکل کر دوسری مضبوط تر کیفیت کی گرفت میں اچانک آ گئی تھی۔ ذکیہ اور اُس کا دوست اُس کی موجودگی محسوس کر کے بھی بے خبر ہی رہے۔

وہ دوبارہ لاؤنج میں پہنچی۔ ممی اور ڈیڈی ”ٹی وی“ دیکھ رہے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

”باجی آپ کیوں اسٹیل ہو رہی ہیں“۔ ذکیہ نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ گم سم ذکیہ اور اُس کے دوست کو دیکھتی رہی۔

”باجی کی خوبصورتی ــــ ایمان سے اِن کی تو کسی پرنس سے شادی ہو سکتی ہے۔ بس اک ذرا سی کوشش کی ضرورت ہے“ ذکیہ کے دوست نے کہا۔

”ذکیہ کی تم سے ابھی شادی نہیں ہوئی کون جانے کل تم اِس سے شادی کرو یا نہ کرو ــــ پھر“ اُس نے بھرپور وار کیا۔

”میں ذکیہ کے علاوہ کسی اور سے شادی کر ہی نہیں سکتا اس لئے کہ اب ذکیہ میری ضرورت ہی نہیں کمزوری ہے اور ذکیہ کی جگہ کوئی اور عورت نہیں لے سکتی“۔

”چھوڑیئے باجی“ ذکیہ نے کہا ”اگر فیضان مجھ سے شادی نہ بھی کرے تو کیا لڑکوں کی کمی ہے کسی دن، کسی وقت بھی اچھے سے اچھے لڑکے سے شادی کر سکتی ہوں۔ مجھ میں خود اتنی صلاحیت ہے“۔

”کسی نوجوان کے خوبصورت الفاظ پر بھروسہ کر کے اُسے بیڈ روم تک لے آنے کے لئے کسی صلاحیت کی ضرورت نہیں۔ بدن کی ہم آہنگی سے زیادہ اہم ذہنی ہم آہنگی اور روحانی تسکین ہے“۔ اس نے کہا لیکن اُسے اپنی یہ بات خود کو بھی بودی لگی۔

”باجی کبھی روح رہی ہو گی مگر آج کی سب سے بڑی سچائی بدن ہے“۔ ذکیہ بولی۔

اُسے چند لمحوں پہلے ذکیہ اور فیضان کے بدن نے جو نامعلوم آسودگی دی تھی وہ تشنگی بن گئی۔ وہ ڈرائنگ روم سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آئی۔ الماری سے ایک خوبصورت ساڑی اور جیولری کا انتخاب کیا۔ بلاؤز پہننے سے قبل اُس نے آئینے میں

اپنا سراپا دیکھا تب اُسے یقین ہو گیا کہ فیضان نے اُس کی غلط تعریف نہ کی تھی۔ اُسے اپنا بدن کسی چٹان کی طرح مضبوط اور کسی معبد میں رکھے ہوئے بُت کی طرح پراسرار محسوس ہوا اُسے اپنی قوت پر اعتماد ہو گیا۔

"پراسرار بت کا یہ مضبوط بت آج ہی توڑ دو" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو ممی نے اُسے روک لیا۔

"رات میں جیولری پہن کر باہر نہیں جاتے اسے اُتار کر کوئی ایمی ٹیشن پہن لو"

جب گھوں گھوں کرتی ہوئی لفٹ اُسے لے کر نیچے جانے لگی تو ہوا کے ایک تیز جھونکے سے نیم کا درخت بیری پر پھر جھک آیا امر بیل اب بیری کے درخت سے اُتر گئی تھی اور بیری حرکت کر رہی تھی۔

○

آدمی کتے کو کاٹ لے تو خبر بنتی ہے افسانہ نہیں حیرت اور سنسنی خیزی افسانہ کے عناصر ترکیبی کا جز ہے کل نہیں۔ افسانہ آغاز سے انجام تک ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ زندگی کے کسی ایک پہلو کی بھرپور تصویر۔ افسانہ میں جھول ہو تو بے ڈول بن جاتا ہے۔ زبان و بیان میں الجھاؤ ہو تو گنجلک ہو جاتا ہے۔ واقعات کا تانا بانا مربوط نہ ہو تو سپاٹ اور بے روح محسوس ہوتا ہے۔ افسانہ نگاری، کوزے میں دریا کو بند کرنے کا فن ہے۔ امراؤ طارق افسانہ نگاری کے ان اسرار و رموز سے خوب واقف ہیں۔ زبان و بیان پر انہیں دسترس حاصل ہے۔ خیال کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالنے کے عمل میں وہ احتیاط اور توازن سے کام لیتے ہیں۔ یہ کمال فن انہوں نے سالہا سال کی ریاضت اور محنت سے حاصل کیا ہے۔ وہ ادب کے کوچہ میں نو وارد نہیں ہیں۔ لگ بھگ ربع صدی سے اس دشت کی سیاحی کر رہے ہیں۔

"بدن کا طواف" ان کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان افسانوں میں تنوع ہے انفرادیت ہے۔ امراؤ طارق نے اپنے افسانوں میں زندگی کے معمولی واقعات کو غیر معمولی بنا کر اس چابکدستی سے پیش کیا ہے کہ قاری کے ذہن کے بند دریچے کھلتے ہیں۔ معاشرے کے اچھے اور برے، تاریک اور روشن گوشے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ تاریکی اور روشنی کا یہ تضاد ان کے ہر افسانے میں ملتا ہے۔ یہ تضاد زندگی کا ارتقائی عمل ہے۔ امراؤ طارق کے افسانوں کی یہی خوبی انہیں افسانہ نگاروں کی محفل میں نمایاں کرتی ہے۔ یہ بات اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کے یہ افسانے ہر حلقے میں پسندیدگی سے دیکھے جائیں گے اور ذوق و شوق سے پڑھے جائیں گے۔

——— شوکت صدیقی

پاکستان آنے کے بعد مجھے بڑا اشتیاق تھا کہ میں یہاں کا نیا افسانہ پڑھوں کیونکہ گذشتہ دس برس سے دونوں ملکوں کے درمیان کتابوں اور رسالوں کا آزادانہ تبادلہ نہیں ہو رہا ہے۔

یہاں آکر میں نے افسانے کی جن نئی آوازوں کو سنا ان میں امراؤ طارق مجھے نمایاں نظر آئے۔ ان کے ہاں اپنے قلم کا احترام بھی ہے اور موضوع کا تنوع بھی ملتا ہے۔ ان کی بعض کہانیوں کا علامتی انداز ہے جو اکثر نئے لکھنے والوں کے یہاں ملتا ہے لیکن ان کی کہانیوں میں ابلاغ کا حسن بھی ہے جس کی وجہ سے ان کا قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ امراؤ طارق پاکستان کے افسانہ نگاروں میں ایک ایسا نام ہے جس سے کہانیاں سننے کے ہم سب منتظر رہیں گے۔

اکتارہ، بدن کا طواف، دراڑوں میں سانپ اور مٹی کے کھلونے ان کے وہ افسانے ہیں جن کا ذکر کئے بغیر افسانے کے نقاد آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔

——— جیلانی بانو

امراؤ طارق کے افسانے پڑھتے ہوئے مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میں ماضی کی بازیافت میں مصروف ہوں۔ مجھے اُردو افسانے کا وہ ماضی یاد آرہا تھا۔ جو دراصل اُردو افسانے کا مستقبل بھی ہے جس میں تجربے بھی ہوتے تھے، موضوعات اور کردار بھی بدلتے تھے انداز و اسلوب بھی سب کے اپنے اپنے ہوتے تھے، مگر جب افسانہ اول و آخر افسانہ ہوتا تھا اور جب اردو افسانے میں پینترے بازی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ میں ماضی کی بازیافت کے اس عمل میں بیدی، منٹو اور کرشن کے بعد پریم چند پر رکا اور یکایک میرے سامنے موپساں اور چیخوف، ورسومرسٹ ماہم ابھرے اور پھر مجھے عالمی ادب کے غیر فانی افسانے یاد آئے اور میں امراؤ طارق کا شکر گذار ہوا کہ اس کے افسانوں نے نئے فکشن کی اس نہایت دلآویز مگر نہایت محنت طلب صنف کی زندگی کا ایک جدید ثبوت مہیا کر دیا۔ جو اس امر کا بھی ثبوت ہے کہ افسانے کے موضوعات بدل سکتے ہیں، کردار بدل سکتے ہیں، مشاہدات بدل سکتے ہیں، نو بہ نو تجربات ہو سکتے ہیں مگر مستقبل میں بھی وہی افسانہ، افسانہ کہلائے گا جو واقعی افسانہ ہو اور جس میں کوئی "کراس ورڈ پزل" پیش کرنے کی بجائے زندگی کی ایک پرت کو، یا انسانی محسوسات کی ایک جہت کو، یا معاشرتی رشتوں کے ایک الجھاؤ کو، یا ایک ایسے لمحے کی باطنی روداد کو پیش کیا گیا ہو جس کی چھوٹ انسانی زندگی کے پورے ماضی پر بھی پڑ رہی ہو اور جس سے حال و مستقبل کے آفاق بھی منور ہونے لگے ہوں۔ یہ سب کچھ امراؤ طارق کے افسانوں میں موجود ہے ورنہ یہ سب کچھ مجھے اس موقعے پر کیوں یاد آتا جب اس کے افسانوں کا یہ مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔

——— احمد ندیم قاسمی